Title – SCIENCE AUR ISLAM.

Creator – Hafiz Qadri Mohd. Taiyab.

Publisher – Muslim University Press (Aligarh).

Date – 1938.

Pages – 92.

Subject –

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ مطبوعات انجمن اسلامی تاریخ و تمدن (۲)

سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

سائنس اور اسلام

یعنی

حضرت الحاج مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی

مہتمم جامعہ قاسمیہ دار العلوم دیوبند

کی وہ معرکۃ الآرا تقریر جو انہوں نے

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کے زیر اہتمام اسلامی ہفتہ کے عظیم الشان اجتماع میں بتاریخ ۸ اگست ۱۹۳۸ء کی

اور حسب فرمائش

جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی نائب صدر انجمن مذکور

محمد حامد اللہ انصاری معتمد نشر و اشاعت

نے مولانا ممدوح سے مرتب کرا کر بغرض افادہ عام

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع کرا کر شائع کی

CHECKED
Date..........

ر اول جلد ایک ہزار

قیمت فی نسخہ صرف ۵

تقریظ

از حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ العالی

(شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل و صدر مہتمم دار العلوم دیوبند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے چند ماہ پیشتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک معرکۃ الآراء تقریر کی تھی جسے بعد میں منضبط کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا اور اس کا نام "سائنس اور اسلام" رکھا گیا ہے۔

چھپنے سے پہلے برادر ممدوح نے مجھے بھی اسکے مطالعہ کا موقع دیا میں اس مضمون کے مطالعہ سے بیحد محظوظ و مسرور ہوا اور دل سے مؤلف کے حق میں دعا نکلی۔

یوں تو اس موضوع پر مختلف مذاق کے لوگ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے لیکن یہ مضمون اپنی نوعیت میں نرالا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مضمون حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی صرف نسبی اولاد ہی نہیں انکے علمی وارث بھی ہیں۔ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز (علی گڑھ) میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا وہ مسلمانوں کے مذہبی مستقبل کے اصلاح کی ایک خوش آئند اور درخشاں علامت ہے حق تعالیٰ ہمارے نو تعلیم یافتہ بھائیوں کو بار بار اس طرح کے افادات سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

شبیر احمد عثمانی

دیوبند

۳ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

GIFT OF
PROF. Dr. M. SHARIF

۷۸۶

انتساب

ہم بصد ادب واحترام اپنے سلسلۂ مطبوعات کے اس دوسرے نمبر "سائنس اور اسلام" کو اس صدی کے نامور مسلم سائنسداں اور اپنی جامعہ کے محبوب وائس چانسلر عالی جناب ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان رحمتہ اللہ علیہ کے کبھی نہ مٹنے والے اسم گرامی سے منسوب کرتے ہیں اور بصد عجز وانکسار حق تعالےٰ جل شانہٗ کی بارگاہ میں انکی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔

فقط

عقیدت کیش

حامد اللہ انصاری

معتمد نشر واشاعت

LYTTON LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH.

پیش نامہ

خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم اپنے سلسلۂ مطبوعات کا دوسرا نمبر شائع کر رہے ہیں جس کے اوراق اس معرکۃ الآرا اور جامع تقریر کے حامل ہیں جو حضرت الحاج مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کے زیر اہتمام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۷ اگست ۱۹۲۳ء کو سائنس اور اسلام کے اہم موضوع پر فرمائی تھی۔

حضرت مولانا طیب صاحب کی ذات گرامی مسلمانان ہند کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مولانا موصوف کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ آپ حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے حقیقی پوتے ہیں اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تحریر کے بموجب "حضرت قاسم العلوم کی نسبی اولاد ہی نہیں۔ بلکہ ان کے علمی وارث بھی ہیں"۔ المختصر آپ اپنے تجر علمی، زہد باطنی، تقدس خاندانی اور کمال علم و فضل کی وجہ سے "لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد" ہی کا مصداق بنے ہوئے ہیں اور اپنی دینی و ملی خدمات کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں مشہور ہیں۔

سائنس اور اسلام حضرت مولانا کے علوم اسلامی، حقائق فرقانی اور معارف قرآنی میں گہرے غور و خوض اور علوم جدیدہ کے وسیع مطالعے کا ایک مبارک ثمرہ ہے جو تقریر کی صورت میں ہم طالبان علم و عمل کے سامنے پیش کیا گیا جس میں حضرت مولانا نے نہایت بسیط پیرایہ میں سائنس اور اس کی حقیقت مادہ کی انواع اور ان کی خاصیت اور اس کے بالمقابل روح اور روحانیت کی عظمت و جلالت، انسان کی روحانیاتی تسخیر اور نوع بشری کے مابہ الامتیاز اوصاف

وکمالات پر فلسفیانہ انداز میں ایک سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ پھر خوبی اور کمال یہ ہے کہ تقریر اپنی عبارت کی سطح سے تو بالکل فلسفہ نظر آتی ہے مگر اپنے باطنی حقائق کے لحاظ سے خالص کتاب و سنت کی روشنی سے ماخوذ ہے مولانا ممدوح نے سائنس کے بنیادی مادّوں کے خواص و آثار کو قرآن و حدیث سے واضح کرتے ہوئے سائنس کا رشتہ اسلام کے ساتھ نہایت ہی لطیف پیرایہ میں قائم کیا ہے۔ درمیان میں مادہ و روح کے متعلق بہت سی عجیب و غریب موشگافیاں اور لطیف بحثیں آگئی ہیں۔ الغرض یہ مختصر مگر جامع مضمون قرآنی حقائق و معارف اور حدیثی لطائف کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے جس کا صحیح اندازہ قارئین کرام مطالعہ کے بعد ہی لگا سکیں گے۔

یہ امر ہمارے لئے موجب حیرت ہے کہ حضرت مولانا جیسا ایک عربی داں عالم جسے دارالعلوم کے مشغلۂ درس و تدریس اور اہتمام و انتظام ہی سے فرصت نہ ملتی ہو دور حاضر کے اس اہم مسئلے اور موضوع پر اپنے ماحول سے بالکل الگ علوم جدیدہ کے ایک بڑے مرکز میں اسقدر جامع پُر مغز اور مدلّل تقریر کرے مگر مولانا اعزاز علی صاحب کی تحریر کے بموجب قاسمی فیضان کیوجہ سے نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقرر ممدوح کی دوسری تقریریں یا تالیفات۔

یہ محض ہماری انجمن کے قابل فخر صدر اور ہماری جامعہ کے ہر دلعزیز و محبوب پرو وائس چانسلر عالی جناب پروفیسر ابو بکر احمد حلیم اور ان کے دست راست یونیورسٹی و انجمن کے سرگرم پروفیسر و نائب صدر جناب ڈاکٹر امیر حسن صدیقی (جن کی مساعی جمیلہ سے یونیورسٹی میں ایک خالص اسلامی فضاء قائم ہوگئی ہے اور طلباء و اساتذہ کی طبعیتیں قرآن و حدیث کے مطالعے کی طرف مائل ہوگئی ہیں) کی سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک وسیع سلسلۂ مطبوعات کا بیڑا اٹھا سکے

اور پیش نظر و ماقبل رسایل شائع کرسکے اور انشاء اللہ آئندہ کرتے رہیں گے۔
قارئین کرام کو یہ معلوم کرکے مسرّت ہوگی کہ ہمارے اس دوسرے نمبر کے ساتھ ساتھ ہماری مطبوعات کا تیسرا نمبر " فردوس گم گشتہ " بھی شائع ہوگیا ہے جس کی تفصیل سرورق کی اپشت پر درج ہے۔ اور ان تین نمبروں کے بعد ہم حسب ذیل مقالات و تقاریر اور شائع کرنیکا قصد رکھتے ہیں انشاء اللہ تعالےٰ

(۴) ایمان - از حضرت علاّمہ سید سلیمان ندوی صاحب
(۵) تمدن اسلام کا پیغام بیسوی صدی کے نام - از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔
(۶) اسلامی تمدن..... از حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیّب صاحب
(۷) ضرورت ہادی و ختم نبوت - از حضرت مولانا حافظ کفایت حسین صاحب

اس رسالے کی اشاعت کیساتھ ساتھ ہمارے دو سرگرم کارکن جناب محمد عبدالوکیل خاں صاحب معتمد اعزازی و میر محمود علی خاں صاحب شریک معتمد ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ ہم ان دونوں عزیز بھائیوں کو کامیابی امتحان کی دعا کیساتھ الوداع کہتے ہیں اور ان سے یہ امید کرتے ہیں کہ یہ جہاں بھی رہیں گے اپنی عزیز درسگاہ و انجمن سے وابستہ رہکر خدمت اسلام انجام دیتے رہیں گے۔

ہماری درخواست پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب اور جناب ڈاکٹر محمد ذکی الدین صاحب نے پیش نظر مقالے پر اپنی اپنی تقاریظ لکھکر ارسال فرمائی ہیں جو ہم شکریہ کیساتھ شائع کرتے ہیں۔

جناب مولوی اشفاق احمد صاحب محرر دارالعلوم دیوبند برادرم غلام جیلانی صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی اور خانصاحب محمد جواہر خان مہتمم مسلم یونیورسٹی پریس بھی ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں جنہوں نے پیش نظر رسالے کی اصلاح و درستی نظر ثانی اور طباعت میں ہماری غیر معمولی اعانت فرمائی۔

محامد اللہ انصاری معتمد نشر و اشاعت

تقریظ

(از جناب ڈاکٹر محمد ذکی الدین صاحب شیخ الطبعیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب کا نام مسلمانان ہند کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے سائنس اور اسلام کے سے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کے سامنے فرمایا۔ اب وہی خطبہ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کریں۔

سائنس اور مذہب کی بحث اور فلسفہ اور مذہب کی بحث مدت سے چلی آتی ہے۔ سائنس اور مادیت کی وجہ سے مذہب کو اسلام اور عیسائیت کو خاص طور پر سخت نقصان پہونچا۔ ساتھ ساتھ علماء کی یہ کوشش رہی کہ ان نقصانات کی تلافی کی جائے۔

ڈریپر (Draper) نے ایک کتاب سائنس و مذہب کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور سائنس کے متعلق مختلف سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ نے پیرس جاکر مشہور و معروف فلسفی رینان (Renan) سے بحث کی اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام سائنس کی مخالفت نہیں کرتا۔ اس کے بعد وہ اس موضوع پر کئی مضامین بھی شائع کر چکے ہیں ان کے بعد انکے شاگرد علامہ محمد عبدہٗ اور علامہ رشید رضا نے مسلسل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

ہندوستان میں سرسید نے اسلام اور سائنس کے متعلق بہت کچھ لکھا! اسلامک ریویو میں خواجہ کمال الدین نے بہت سے مضامین شائع کئے۔ مولانا عبد العلیم صدیقی اور دیگر علماء نے متعدد خطبات اور مضامین اس سلسلہ میں دئے۔ علماء کی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ (۱) سائنس اسلام کے مخالف نہیں (۲) جب مسلمان عروج پر

تھے تو انہوں نے بہت سی سائنس کی ایجادات کیں جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ سائنس اسلام کی مخالفت نہیں کرتا۔

مصر میں علامہ طنطاوی نے "تفسیر جواہر" ۲۲ جلدوں میں شائع کی ہے اسمیں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کا تعلق سائنس سے دکھایا جائے اور ایک حد تک اس میں علامہ موصوف کو کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلی صدی میں یہ ایک شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سائنس کے مختلف اصولوں اور نظریوں کو قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کیا جائے اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی فاش غلطی علماء سے سرزد ہوئی وہ یہ کہ انہوں نے سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو ابدی Eternal سمجھ لیا اور یہ بالکل بھول گئے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے سائنس کے نظریوں اور اصولوں کی خامیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان میں وقتاً فوقتاً زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ساتھ ساتھ ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن شریف خدا کا پیغام ہے! ور ہمیشہ کے لئے آیا ہے" جو دو متضاد باتیں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ فاضلانہ خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے پورے طور پر مستفید ہوں گے اور یہ خطبہ ہمارے ان نوجوانوں کے لئے جن کے دماغ میں "سائنس اور الحاد" مترادف ہے مشعل ہدایت ہوگا۔

CHECKED-2002

M.A.LIBRARY, A.M.U.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سائنس اور اسلام

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما خلق اللہ الارض جعلت تمید فخلق الجبال فقال بہا علیہا فعجبت الملائکۃ من شدۃ الجبال فقالوا یا رب ھل من خلقک شئ اشد من الجبال قال نعم الحدید فقالوا یا رب ھل من خلقک شئ اشد من الحدید قال نعم النار فقالوا یا رب ھل من خلقک شئ اشد من النار قال نعم الماء فقالوا یا رب ھل من خلقک شئ اشد من الماء قال نعم الریح فقالوا یا رب ھل من خلقک شئ اشد من الریح قال نعم ابن آدم تصدق صدقۃ بیمینہ یخفیہا من شمالہ (رواہ الترمذی)

ترجمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالی نے زمین کو پیدا کیا تو وہ کانپنے اور ڈولنے لگی۔ تب اللہ تعالی نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور ان سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا ملائکہ نے پہاڑوں کی شدۃ وصلابتہ پر تعجب کیا اور کہنے لگے کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں کوئی چیز پہاڑوں سے زیادہ بھی سخت ہے فرمایا ہاں لوہا ہے۔ اس پر پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں لوہے سے بھی بڑھکر کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آگ ہے۔ پھر عرض کرنے لگے کہ

آلٰہی آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ تو پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آدم کی اولاد ہے جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہو۔ (روایت کیا اسے ترندی نے)۔

تمہید

صدر محترم

بزرگان قوم و برادران عزیز طلبہ۔ مجھے اس وقت جس موضوع پر تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا عنوان "سائنس اور اسلام" ہے۔ مجھے جس طرح اس پر تعجب ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ایک مرکزی جگہ پر قوم کے منتخب فضلا مختلف علوم و فنون کے ماہر اور مخصوص ارباب کمال جمع ہیں تقریر کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت طالبعلم اور ناکارہ علم و عمل کا انتخاب کیا گیا اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا زائد اسپر تعجب ہے کہ تقریروں کے اہم موضوعات میں سے اس اہم تر بلکہ مشکل ترین موضوع کو مجھ ناچیز کے سر عائد کیا گیا ہے؟ عنوان مذکور حقیقتاً ایک غیر معمولی عنوان ہے جس کے لئے معمولی قابلیت کافی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ عنوان "سائنس اور اسلام" اپنی لفظی حیثیت میں جس قدر سہل اور مختصر ہے اُسی قدر اپنی معنوی وسعت اور وقت کے لحاظ سے طویل اور صعب ترین ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ عنوان تین چیزوں پر مشتمل ہے ایک سائنس دوسرے اسلام تیسرے ایک درمیانی عطف۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کے ماتحت تین امور کی تشریح مقرر کے ذمہ عائد ہوجاتی ہے۔ ایک سائنس کا مفہوم اور اس کی

حقیقت دوسرے اسلام کا مفہوم اور اس کی حقیقت تیسرے ان دونوں کی باہمی نسبتہ اور اس کا حاشیتین سے ارتباط اور پھر ایک چوتھی چیز ان تین سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ان تین امور کا مقتضی ہے یعنی اگر سائنس اور اسلام اور ان کی درمیانی نسبتہ واضح ہو جائے تو یہ ایک واقعہ کا اثبات ہوگا۔ مگر ہر واقعہ محض واقعہ کی حیثیت سے ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جب تک کہ اس سے کوئی عمل کوئی حکم اور کوئی طلب نہ پیدا ہو اس لئے چوتھا مقصد یہ ہوگا کہ ان تین ثابت شدہ حقائق کا ہم پر تقاضا کیا ہے اور یہ واقعات ہم سے کیا چاہتے ہیں اس لئے اس تقریر کے موضوع سے تین مقصد پیدا ہوتے ہیں جن پر اس مضمون کی بنیاد ہو گی سائنس اور اسلام کی حقیقت۔ سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبتہ اور سائنس اور اسلام سے پیدا شدہ موعظت۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور جس قدر اہم ہیں اسی قدر میری نسبتہ سے صعب اور مشکل ہیں۔ کیونکہ اول تو اسلامی حقائق ومقاصد ہی پر سیر حاصل روشنی ڈالنا ایک بے مایہ طالب علم کے لئے یقیناً دشوار گذار ہے تاہم اگر اس حیثیت سے کہ مجھے علمار کی ایک مرکزی جماعت (علمار دارالعلوم دیوبند) کی جوتیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور ھم القوم لا یشقی جلیسہم کے قاعدہ کے مطابق میں کوئی ایک آدھ جملہ اسلام کے مقاصد کے متعلق کہہ بھی دوں تو بہر حال سائنس تو میرے لئے ہر صورت میں ایک نئی اور اجنبی چیز ہے نہ میں اس کے اصول سے واقف ہوں نہ فروع سے باخبر۔ اور نہ فنی حیثیت سے مجھے اس کے مبادی اور مقاصد سے کوئی تعارف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کے اطراف میں سے اگر ایک طرف بھی گوشہ چشم سے ایکطرف رہجائے تو طرفین کی درمیانی نسبتہ پر روشنی ڈالنا کس قدر مشکل ہے؟ تاہم جبکہ ایک محترم جماعۃ کی طرف سے مجھے اس پر مامور کیا گیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ من اللہ ایک طلب ہے اس لئے غیبی امداد کی توقع پر جرأت ہوتی ہے کہ عنوان زیر نظر پر اپنی بساط کے موافق

کچھ کلام کروں اور سامعین سے اپنے اغلاط کے سلسلہ میں عفو و مسامحۃ کی درخواست کر کے امیدوار تسامح رہوں۔

حضرات اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے وہ عنوان مذکورہ کی تینوں جہات پر انتہائی جامعیت کے ساتھ حاوی ہے۔ اور اس میں میرے علم و فہم کے مطابق پہلے سائنس کی جوہری حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ گویا اس کا مغز اور لُب لباب کھول کر سامنے رکھ دیا گیا ہے اس کے بعد اسلام کی اصلیت و انکشاف فرمائی گئی ہے اور پھر ان دونوں چیزوں کی باہمی نسبتہ اس انداز سے آشکارا کی گئی ہے جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مقصودیت کی شان کس کو حاصل ہے اور وسیلہ محض ہونے کی کس کو؟ اور پھر یہ کہ اس وسیلہ سے اس کے مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر حصول مقصد کے بعد اس پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں جن کی توقع پر تحصیل مطلوب کی سعی کی جائے؟

ہاں مگر حدیثی حقائق کھولنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میں سائنس کا موضوع متعین کر دوں تاکہ اس پر انضباط کے ساتھ بحث کی جا سکے مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ فن سائنس کے موضوع کی تعین فن کی حیثیت سے تو میری قدرت میں اس لئے نہیں کہ میں نے اس فن کی تعلیم نہیں پائی البتہ اس کے مشہور اور زبان زد آثار کو سامنے رکھکر اپنی ذہنی سعی سے سائنس کا جو کچھ موضوع متعین کر سکتا ہوں اُسی کو عرض کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ اگر میں اس میں غلطی کروں گا تو اس مرکز کے اہل فن اور سائنسدان اوستاد مجھے اس غلطی پر قائم نہ رہنے دیں گے۔

فن سائنس کا موضوع

حضرات اس دور ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادیات کے نئے نئے انکشافات کا

چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر نے اپنی ایجادات کی کرشمہ سے دنیا کو دیوانہ بنا دیا مثلاً وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ہی ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہری آثار ہیں۔

یا مثلاً وسائل نقل و حرکت کے سلسلہ میں جب ریل۔ موٹر۔ ہوائی جہاز اور دوسری بادپا سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع و حرف کے سلسلہ میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب و غریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجنیری کے نئے سے نئے اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگذاریاں ہیں۔ اسی طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات پھل پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار و خواص کے متعلق انکشافات کا جب نام لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آ جاتا ہے اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہونچانے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب و غریب پھرتیلی صورتیں کیمیاوی طریق پر فن دوا سازی کی حیرتناک ترقی تحلیل و ترکیب کی محیر العقول تدبیریں بجلی کے ذریعہ معالجات کی صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں تو ساتھ ہی انتہائی وقعت کے ساتھ سائنس کا نام بھی زبان زد ہوتا ہے کہ یہ سب اسی کے درخشاں آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجہ پر پہونچایا ہے کہ سائنس کا موضوعِ عمل موالید ثلاثہ جمادات۔ نباتات۔ اور حیوانات کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔

پھر چونکہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ آگ۔ پانی۔ ہوا۔ مٹی سے

ہوتی ہے (جو تقریباً ایک مسلّمہ چیز ہے اور اس لئے اس پر کسی استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں) اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظ حقیقت عناصر اربعہ ٹھہر جاتے ہیں جن کی خاصیات اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل و ترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردۂ ظہور پر لاتے رہنا سائنس کا مخصوص دائرۂ علم و عمل ہو جاتا ہے پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیریں درحقیقت انہی چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر اس تفصیلی حقیقت کا مختصر عنوان میں خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کا موضوع "مادہ اور اس کے عوارض ذاتیہ" سے بحث کرنا ہے اور بس پس جو شخص بھی مادیات میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہکر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہوگا وہی سب سے بڑا سائنسداں اور بہترین ماہر سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

موضوع متعین ہو جانے کے بعد اب سائنس کے اس چورنگ مادہ آگ۔ پانی ہوا۔ مٹی پر (جس کا مرتب بیان حدیث زیب عنوان میں کیا گیا ہے) ایک ذرا سا غور فرمائیے تو محسوس ہوگا کہ

عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار

ان چاروں عنصروں کے خواص و آثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں بلکہ کافی حد تک متفاوت ہیں۔ اور نہ صرف عوارض و آثار ہی میں تفاوت ہے بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی کوئی قوی تر ہے اور کوئی اقوی تر، اور پھر یہ قوۃ و ضعف کا تفاوت بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں بلکہ

معیاری ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی گئی ہے اور پھر طاقت ہی کے اندازہ سے اس میں غلبہ و تسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے اور جس حد تک لطافت کم ہو کر کثافت کے لئے جگہ خالی کرتی گئی ہے اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی گئی ہے۔ اور پھر کمزوری کی قدر اس میں بے بسی مغلوبیتہ اور ذلتہ و پستی بھی نمایاں ہوتی گئی ہے۔

راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصف کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذات بابرکات ہے اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے اور اسی قاعدہ سے بوجہ لطافت طاقتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ چنانچہ اس کی بے انتہا لطافت کا عالم تو یہ ہے کہ آنکھوں سے اوجھل حواس و خیال کی حدود سے بالاتر اور ادراک و انکشاف کی حدبندیوں سے وراء الورٰی ہے پھر اس کی بے انتہا طاقت کا کرشمہ یہ ہے کہ تمام جہانوں پر اپنی اور صرف اپنی شاہنشاہی کا نظام محکم قائم کئے ہوئے ہے اس لئے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی شمہ ہے وہ درحقیقت اس کی ذات وصفات کا کوئی پرتو ہے جس کا اثر بقدر استعداد اس نے قبول کر لیا ہے اور جبکہ قبول اثر بغیر کسی مناسبتہ کے نہیں ہوتا اس لئے یہ کہا جانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہر لطیف شے کو بقدر لطافت حق تعالیٰ سے مناسبتہ ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو ذات بابرکات کے ساتھ قرب و تناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی غالب اور با اقتدار بنتی جائے گی۔ ادھر کثائف کو اس کی ذات سے بے انتہا بُعد اور بیگانگی ہے کہ وہاں کثافتہ کا نشان نہیں اس لئے جو چیز بھی بقدر کثافت اس لطیف و خبیر سے دور پڑتی جائے گی اسی درجہ پست مغلوب اور ذلیل ہوتی جائیگی اور اس میں سے غلبہ و استیلاء کی شان نکلتی جائیگی۔ بالکل اسیطرح جسطرح پانی سے کوئی چیز قریب ہو جائے تو اس میں پانی کے آثار برودت و رقت وغیرہ

سرایت کرتے چلے جائیں گے آگ سے قریب ہو جائے تو حرارت و نخوت وغیرہ کے آثار راسخ ہو جائیں مٹی سے قریب ہو جائے تو یبوست اور خشکی کے آثار گھر کر جائیں۔

اسی طرح جو چیز کسی وصف کے ذریعہ بھی ذات بابرکات حق سے قرب و مناسبت پیدا کرے گی وہ اسی حد تک بقدر استعداد شئون ربّانی اور صفات کمال کا مرکز و محور بنتی چلی جائے گی اور ضرور ہے کہ اس میں استیلاء و استغناء کا ظہور ہو اور وہ قوی تر غالب تر اور رفیع المنزلت ہوتی جائے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ حسیات میں قرب بھی حسّی ہوتا ہے اور آثار قرب بھی محسوس طریق پر نمایاں نظر آتے ہیں مگر اس کی بارگاہ رفیع میں حس کی رسائی نہیں اس لئے اس کا قرب بھی حسّی ہونے کے بجائے وصفی ہے یعنی جو چیز اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے اس سے قرب و مناسبت کا درجہ حاصل کرے گی وہی اس کے کمالات سے بقدر استعداد حصّہ پانے لگے گی اور اسی حد تک غلبہ و تسلّط اور استغناء و استیلاء اس کے حصّہ میں آجائیگا۔

عنصر خاک

اس معیار کے ماتحت جب ہم عناصر اربعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ کثیف عنصر مٹی نظر آتا ہے جس کا مخزن یہ زمین ہے یہ خاک کا ڈھیر کثیف ہی نہیں بلکہ کثافت آ[illegible] بھی ہے ساری چیزوں میں اگر کثافت و غلاظت آتی ہے تو اس مٹی ہی کی بدولت آ[illegible] ہے آگ نے آج تک کسی چیز کو گندہ اور غلیظ نہیں کیا یہ الگ بات ہے کہ آگ پر [illegible] سے کسی چیز میں غلظت آجائے سو یہ غلظت آگ میں سے نہیں آتی بلکہ آگ اس شئے کا [illegible] لطیف کھینچ لیتی ہے جس سے اس کا اصل مادۂ غلیظہ باقی رہکر نمایاں ہو جاتا ہے ا[illegible] شئے غلیظ معلوم ہونے لگتی ہے سو آگ اس میں کوئی چیز ڈالتی نہیں بلکہ اس سے [illegible]

نکال لیتی ہے پس یہ غلظۃ آگ میں سے نکالا نہیں آتی بلا خود اس شے کی ذات میں سے
اٹھ کھڑی ہوتی ہے جبکہ آگ اس کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے۔ اسی طرح پانی کسی چیز کو
مکدر اور غلیظ نہیں بناتا بلکہ اس کی بدولت تو غلاظتیں اور کدورتیں صاف کی جاتی ہیں
کہ اس کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے اسی طرح ہوا بھی کسی چیز کو مکدر اور گندہ نہیں
کرتی یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طریقہ پر اجزاء ارضیہ رلے ملے چلے آئیں اور
کسی شے کو مکدر بنا دیں تو پھر یہ کدورت بھی زمین ہی کا فیض ہوگا نہ کہ ہوا کا۔ اس لئے
انجام کار ساری کثافتوں کی جڑ بہ خاک دھول ہی نکلتی ہے جس کو لطافت سے دور
کی بھی کوئی مناسبت نہیں اس لئے عام عناصر میں اس کی کوئی بھی وقعت نہیں آپ
ساری ہی زمین کے اس طویل و عریض کرہ کو لے لیجئے اس میں بجز پامالی اور ذلت و مسکنت
کے اور کوئی جوہر دکھائی نہ دیگا یہ زمین رات دن روندی جاتی ہے مگر ذلت و پستی کا یہ عالم
ہے کہ چوں تک نہیں کر سکتی نہ اس میں ادراک ہے نہ احساس نہ غلبہ ہے نہ اقتدار اگر
غلبہ ہے تو دوسرے تمام عناصر کا خود اسی پر ہے گویا سارے ہی عناصر کا قدم اس کے
سر پر ہے اور ہر ایک عنصر کا یہ کھلونا ہے ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے پانی اسے بہائے
پھرتا ہے آگ اسے جھلستی رہتی ہے مگر یہ ذرا بھی زور نہیں دکھا سکتی کہ زور ہو تو دکھائے
طاقتیں تو اس کی کثافت مطلقہ نے سلب کر رکھی ہیں زور آئے تو کہاں سے آئے؟
پھر فقدان لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مادہ بھی کثیف اور صورت بھی کثیف اسے
کتنا ہی صیقل کرو مگر سطح پھر بھی کرکری ہی رہے گی۔ نہ چکناہٹ قبول کریگی نہ چمکاہٹ
پھر نہ صرف کثیف المادہ اور کثیف الصورۃ ہی ہے بلکہ کثیف الطبع بھی ہے ایک ڈھیلے
کو کتنا ہی زور سے اوپر پھینکو جب تک پھینکنے والے کا عارضی زور اس کی ساتھ رہیگا
وہ اونچا ہوتا چلا جائیگا لیکن جب اس کی اصلی حالت اور ارضی طبیعت عود کرے گی
تو پھر نیچے ہی آپڑے گا۔ بہر حال جبکہ زمین کے مادہ صورت اور طبیعت میں کسی جہت

سے بھی لطافت نہیں گویا اُسے ذات اقدس سے اس وصف میں بُعد مطلق حاصل ہے تو ضعف مطلق اور ذلۃ مطلقہ بھی اسی عنصر کے حصہ میں آنی چاہیئے تھی اس لئے قرآن کریم نے زمین کو ذلیل ہی نہیں بلکہ ذلول فرمایا ہے جو ذلۃ کا مبالغہ ہے ارشاد ربانی ہے:-
ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا -

ہاں اس زمین کا ایک جزو پہاڑ بھی ہیں جن کی مٹی یعنی ریتہ نے بہ نسبتہ غُبار کے کچھ لطافت و ستھرائی قبول کر کے کدورت و کثافت سے قدرے بُعد پیدا کرلیا تو اسکی شان اسی حد تک مٹی سے فائق ہو گئی چنانچہ خشک ریتہ کو اگر جھاڑ دو تو بکھر جاتا ہے۔ پانی ڈالو تو کیچڑ نہیں بنتا اس کے ذرات کو دیکھو تو چمک بھی اٹھتے ہیں اس پر نظر ڈالو تو خاک کی بہ نسبتہ نظر فریب بھی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اس کی صاف ستھری صورت اور اس کی آب و تاب دیکھ کر پانی اور دریا کا بھی شبہ ہو جاتا ہے غرض جس حد تک اس میں لطافت و ستھرائی آئی تھی اسی حد تک وہ بہ نسبتہ غبار کے عزیز الوجود بھی ہو گیا اس کی قدر قیمت بھی بڑھ گئی اور پھر اس کی ترکیب سے اگر پتھر اور پتھروں کی ترکیب سے پہاڑ بنے تو ان کی عظمت و شان اور قدر و قیمت زمین کی سطح سے کہیں دوبالا ہو گئی۔ چنانچہ مٹی کی نسبتہ پتھروں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں بلکہ مٹی کی پختہ سے پختہ اینٹوں کو ایک پتھر سے چکنا چور کر دیا جا سکتا ہے لیکن مٹی کے تودے پتھروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اگر پہاڑ کی کوئی چٹان زمین پر آگرے تو زمین دہل جاتی ہے دب جاتی ہے اور اس میں گہرا غار قائم ہو جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف مٹی کا منوں ڈھیر بھی اگر کسی سنگین چٹان پر آپڑے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے شکستہ بنائے نہ وہ ہلتی ہے نہ اس میں غار پڑتا ہے۔ پھر انہی پتھروں میں بھی جوں جوں صفائی ستھرائی اور جلا بڑھتی جاتی ہے ان کی قیمت اور معنوی طاقت بھی ترقی کرتی جاتی ہے سنگ خارا عام پتھروں سے قیمتی سنگ مرمر اس سے زیادہ قیمتی

جواہرات اور لعل و یاقوت اس سے زیادہ قیمتی ہیرا اس سے زیادہ قیمتی فرق ہے تو
وہی لطافت و کثافت اور غلاظت و صفائی کا ہے۔ زمین کی عام سطح تو اس حد تک
کثیف تھی کہ اسے کتنا ہی صیقل کر دلیکن ہاتھ پھیرنے سے کامل چکنا ہٹ کبھی محسوس
نہیں ہوسکتی لیکن پتھروں میں بوجہ لطافتہ مادہ یہ قابلیت ضرور ہے کہ اگر انہیں صیقل کرد
تو مسکہ کی طرح سے املس اور چکنے ہو جاتے ہیں پھر بعض میں چمک پیدا ہو جاتی ہے
اور بعض جھٹپٹا سا عکس بھی دکھلانے لگتے ہیں پس پتھروں نے جس حد تک بھی
صفائی قبول کی اسی حد تک ان میں شدۃ و قوۃ پیدا ہو گئی۔ بہر حال پہاڑ اور انکا
مادہ بہ نسبتہ زمین اور اس کے غبار کے لطیف ہے اس لئے طاقتور بھی ہے، اور زمین
سے کہیں زیادہ شدۃ و صلابت اور قوۃ کا مالک ہے پس وجہ شدۃ و قوۃ وہی
لطافت و ستھرائی نکل آتی ہے۔

لیکن یہی پہاڑ اور ان کے شدید القویٰ پتھر جن کی شدۃ کے سامنے زمین
تھرا بھی نہیں سکتی تھی اور پامالِ محض تھی اسی وقت تک شدید ہیں جبکہ زمین کی خاک
دھول سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے لیکن اگر کہیں پہاڑوں کی ان شدید و مدید چٹانوں کا
سامنا لوہے سے ہو جائے تو پھر ان کی یہ ساری سنگدلی ہوا ہو جاتی ہے لوہے کی
ایک بالشت بھر کدال بڑی بڑی چٹانوں کا منٹوں میں فیصلہ کر دیتی ہے وزنی
وزنی پتھروں کو چکنا چور ہوتے دیر نہیں لگتی ریلوں کی پٹڑیوں پر یہ دو طرفہ لاکھوں
من بجریوں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہیں جو چھوٹی چھوٹی کدالوں
کی برکت سے مٹی اور لائن دبانے کی خدمت پر لگا دئے گئے اور اپنی بے انتہا
رفعت سے گر کر اس بے انتہا پستی پر آ تھمے ان پتھروں پر لوہے کی کدالیں اسطرح
پڑتی ہیں جیسے ایک دست و پا بستہ قیدی کے سر پر کوڑے اور بید پڑتے ہیں
کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا اس سے صاف واضح ہے کہ لوہا پتھروں سے زیادہ شدید

اور طاقتور ہے۔ کیوں؟ راز اس کا بھی وہی لطافت ہے لوہے کے اجزار نے خلقی طور پر پتھروں کے بہ نسبت زیادہ صفائی اور ستھرائی قبول کی ہے اور اس میں مٹی تو کیا ریت جیسی کثافت نہیں ہے۔ لوہے کا برادہ اتنا نہیں پڑتا کہ چیزوں کو آلودہ کردے بہتہ اگر پانی میں بھی پڑجاتا ہے تو بہرحال اسے کسی نہ کسی حد تک مکدر کردیتا ہے کہ آخر کا خاک ہی ہے مگر لوہے کے اجزار اگر برادہ کرکے بھی پانی میں ڈالدئے جائیں تب بھی اس کی جلار اور رقت و سیلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر لوہے پر پالش کردی جائے تو چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے بلکہ اگر اسے صیقل کردو تو آئینہ بن جاتا ہے جو باریک سے باریک خط و خال تک کا عکس دکھلانے لگتا ہے لیکن پتھر میں نہ ایسی پالش قبول کرنے کی استعداد ہے اور نہ وہ اس طرح کے صیقل ہونے کی صلاحیت ہی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس پتھر اگر منجھد کر اشیار کی ذات کا سراپا کسی حد تک نمایاں کرسکتا تھا تو لوہا اس سراپا کی تمام باریک سے باریک خوبیاں بھی عیاں کرسکتا ہے۔ اس لئے لوہے کی لطافت پتھروں سے کہیں زیادہ نکلی۔

بس اسی لطافت کی بنار پر لوہا تو پتھروں پر گراں اور طاقتور ہے اور پتھر اپنی کثافت کی بنار پر اس کے سامنے ذلیل و خوار ہے پس بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی اس نمایاں عظمت و ہیبت کے باوجود ذرا سے لوہے کے سامنے اپنے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

عنصر آتش

لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے جب ہی تک طاقتور ہے جب تک کہ پتھروں کے سر پہ ہے لیکن اگر اسی لوہے کو کہیں آگ چھو جائے یا لوہے کا بڑے سے بڑا ٹکڑا کسی لوہار کی بھٹی میں پہنچ جائے تو اس کی یہ ساری رویں تنی خاک میں ملجاتی ہے آگ لگتے ہی پہلے تو اس کا

رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے وہ اپنی صورت نوعیہ اور ذاتی خاصیت تک کو بھی
برقرار نہیں رکھ سکتا آگ اس کے جگر تک میں گھس کر اُسے ہم رنگ آتش بنا ڈالتی ہے پھر
اگر اس غریب لوہے کو آگ کی بھٹی سے تھوڑی دیر اور نہ چھڑایا جائے تو آگ اسے گلا کر پانی
کی طرح بہا دیتی ہے۔ اور اس کی شدۃ و صلابت کی کچھ بھی پیش نہیں چلتی۔ کوئی کہاں تو
اس لوہے سے کہے کہ پہاڑ کی ایک چھوٹی سے چھوٹی ٹیکری کا سر کچل دے؟ اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ غور کرو تو اس کا
راز بھی وہی عقلی اور طبعی اصول ہے کہ آگ میں لوہے سے بھی زیادہ لطافت موجود ہے
اور لوہا اس کے مقابلہ میں کثیف ہے لوہے میں اگر اتنی لطافت تھی کہ وہ باوجود پتھروں
کی طرح کثیف المادہ ہونے کے عوارض کے سبب رقت و سیلان قبول کر لیتا تھا تو آگ
اپنی ذات سے ہی کوئی ٹھوس ٹکڑا جسم نہیں رکھتی جس میں کوئی چیز گھس نہ سکے ادھر تو ہر چیز آگ
کے جگر میں گھس سکتی ہے اور ادھر آگ بھی ہر چیز کے جگر تک میں سرایت کر جاتی ہے۔
جس کی صلاحیت لوہے میں نہیں۔ پھر لوہا اگر کسی وقت چمک کر باہر سے نورانی شعاعیں
قبول کر لیتا تھا تو آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں سے خود شعاعیں پھوٹتی
ہیں یعنی لوہا دوسروں کی روشنی قبول کرتا ہے اور آگ اپنی روشنی خود دوسروں پر
ڈالتی ہے خود بھی روشن ہے اور دوسری تاریک چیزوں کو بھی روشن کر سکتی ہے پھر
صیقل شدہ لطیف لوہا جسے آئینہ کہتے ہیں اس لطافت صورت کے باوجود پھر بھی اتنا
ثقیل الجسم اور کثیف المادہ ہے کہ اگر اس پر ہاتھ مارو تو اس کے متکاثف جسم سے ہاتھ
ٹکرا کر واپس آ جاتا ہے لیکن آگ کی جسمانی لطافت کا عالم یہ ہے کہ اس کے جسم میں
سے ہاتھ آر پار نکل جاتا ہے اور پھر بھی اس کا جسم نہیں ٹوٹتا۔ پھر صیقل شدہ لوہا تو
صرف عکس ہی قبول کرتا ہے لیکن آگ اصلی جسم ہی کو قبول کر لیتی ہے اور پھر بھی اس
کے جسم میں پھٹن نہیں پائی جاتی اور وہ کسی دوسرے جسم کے تداخل سے ذرا نہیں

ہوتی اس لئے وہ لوہے سے زیادہ شدید اور زیادہ طاقتور ہے۔ بلکہ اسی لطافت کی حد تک اس کا حلقۂ اثر بھی کثیف اشیاء کی نسبتہ وسیع ہوتا گیا ہے۔ پتھر اور لوہا جہاں رکھا ہوا ہے اتنی ہی جگہ اس سے پُر ہو جاتی ہے اور اس حد سے باہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن آگ جس مکان میں ہے اس سے باہر تک اس کے اثرات نورانیت وحرارت پہونچتے ہیں اور اگر آگ اور اس کا مکان نگاہوں سے اوجھل بھی ہو تب بھی اس کے پھیلنے والے آثار اس کے وجود کی خبریں دور دور تک پھیلاتے رہتے ہیں اس لئے آگ لوہے پر غالب ہے اور اُسے فنا کے گھاٹ اتار ڈالتی ہے۔

عنصر آب

لیکن یہی دہکتی ہوئی آگ اور اس کا یہ کر وفر جب ہی تک قائم ہے جب تک اس کے آس پاس کہیں پانی کا نشان نہ ہو اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر آگریں تو آگ کی چمک دمک اور یہ تعلّی وترفع کہ سرنیچا ہی نہیں کرتی سب ختم ہو جاتی ہے۔ پانی اس کے وجود ہی کو باقی نہیں چھوڑتا کہ وہ کچھ اُبھر سکے۔ بلکہ جس لکڑی کو کچھ دیر آگ سے اپنی جان بچانا ہے وہ پانی کی چادر اوڑھ لے یا نمناک ہی ہو جائے آگ جھلس مار کر رہجائے گی۔ لیکن اس کا گیلی لکڑی پر کوئی بس نہ چلے گا۔ بہرحال جہاں پانی موجود ہو وہاں آگ کے پر نہیں جم سکتے خواہ پانی آگ پر چھڑک دو یا آگ پانی میں گرادو آگ کی خیر نہیں رہتی بڑے سے بڑا انگارا پانی میں گرادو تو اس کے گرتے ہی پانی ادھر اُدھر ہٹ جائیگا۔ اور پھر اچانک چاروں طرف سے سمٹ کر اس انگارے کو دبوچیگا تو وہ غریب روسیاہ ہو کر رہجائے گا غرض یہ اس کے سامنے آئے یا وہ اس کا سامنا کرے ہر صورت میں پانی کی طاقت کے سامنے آگ کی شعلہ زنی کچھ بھی کارگر نہیں ہوتی جس سے پانی کی شدۃ وطاقت آگ پر نمایاں ہو جاتی ہے لیکن اس

غلبۂ و مغلوبیتہ کی رُوح یہاں بھی وہی اُصول ہے جس کو ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ آگ اپنی لطافت جسم کے سبب کسی شئے کی ذات کو اپنے اندر کھپا لیتی تھی لیکن اس کا چہرہ اتنا صاف نہ تھا کہ اشیاء کا عکس قبول کر سکے مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر کھپا لیتا ہے کہ وہ فقط لطیف المادہ ہی نہیں بلکہ لطیف الصورۃ بھی ہے۔ یعنی کچھ ہی اُس میں ڈالدو ہر چیز اُس کے قعر اور جگر میں سما جائے گی پھر اس رقتہ و سیلان کے باوجود اس کا چہرہ یا سطح اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آئینہ کی طرح صورت بھی دکھلا دیتا ہے پانی کی یہ صفتہ کہ ہر چیز اس سے آر پار نکل جاتی ہے گو آگ کو بھی میسّر ہے لیکن پانی کا کمال لطافت یہ ہے کہ نگاہ تک بھی اُس سے آر پار ہو جاتی ہے جو آگ میں ممکن نہیں۔ پس پانی لوہے کی تصویر کشی اور آگ کے عدم [illegible] دونوں لطافتوں کا جامع ہے اس لئے اس کی قوۃ بھی آگ اور لوہے کی طاقت سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تو آگ اور لوہے دونوں کو ختم کر سکتا ہے لیکن یہ دونوں اس پر غالب نہیں آ سکتے اور اسی لئے پانی کا حلقۂ اثر بھی آگ سے زیادہ وسیع ہے۔ آگ کا اثر اگر اُسے کسی بند اور محدود مکان میں روشن کیا جائے اسی مکان کی چہار دیواری تک محدود ہوگا لیکن پانی جس مکان میں محدود و مسدود ہے اس سے باہر بھی دور دور تک نمی اور رطوبت کے آثار پھیلے ہوتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں تو آب و ہوا ہی نہیں لوگوں کے مزاج تک مرطوب ہو جاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب اس کی لطافت اور سرعتہ نفوذ کے کرشمے ہیں لوہا اور آگ مسامات میں نہیں گھس سکتے لیکن پانی بوجہ لطافت خاص باریک سے باریک منفذ میں گھر کر لیتا ہے اور جب کہ غلبۂ و طاقت بقدر لطافت ہے تو پانی کی طاقت بھی بلا شبہ آگ سے کہیں بڑھ کر رہی۔

عنصر ہوا

اب آگے چلو بھی پانی جو آگ کا نقش بحس مٹا دیتا ہے ہوا کے سامنے یہ سکین بھی عاجز اور ناتواں ہے اور اُس کی کچھ بھی پیش نہیں چلتی وہ چلتی ہوا میں اگر سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ پانی کی موجیں بلکہ فوجیں کی فوجیں ایک دوسرے پر گرتی پڑتی پھرتی ہیں سمندر کے عظیم الشان کرہ کو بایں عظمت و ہیبت قرار نہیں ہوتا ٹھہرا ہوا پانی ہو تو ہوا اُسے خشک کر ڈالتی اور اُڑا دیتی ہے اگر پانی کا کوئی مخزن و منبع نہ ہو جو اس کی مدد کرے تو پانی کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اس سے معلوم ہوا کہ ہوا پانی پر بھی غالب اور حکمراں ہے وجہ وہی اُصول ہے کہ ہوا آب عناصر سے بڑھکر لطیف و شفاف ہے۔ چنانچہ اس کی جسمانی لطافت کا تو یہ عالم ہے کہ نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اُس کی لطافت کے سامنے کثیف ہے جو اُس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی۔ بدن کو لگ کر گو ہوا محسوس ہو جائے جس سے اُس کے جسم ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اور کوئی لطیف سے لطیف ما سہ حتی کہ تا زنگاہ بھی جو الطف ترین اجسام ہے نہ اس میں نفوذ کر سکتا ہے نہ اُس کا اوراک ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہوا اپنی شدہ لطافت کے سبب رنگ و روپ کو بھی قبول نہیں کرتی کہ یہ چیزیں بہرحال نگاہ و بصری سے متعلق ہیں اور وہ بصری کو قبول نہیں کرتی تو محسوسات بصر تک کیا نوبت پہونچ سکتی ہے۔ ہاں آواز اور خوشبو جیسی لطیف اشیاء جن کی نہ کوئی حسی شکل ہے نہ ہیئۃ ہوا سے ساز کر لیتی ہیں اور اپنی لطافت کی بدولت ہوا میں سما جاتی ہیں جنہیں ہوا قبول کر کے ادھر سے اُدھر منتقل کر دیتی ہے۔

پھر اثر کا یہ عالم ہے کہ فوق و تحت کے گوشہ گوشہ اور ایک ایک منفذ میں

موجود جہاں آگ کی روشنی اور پانی کی نمی نہیں پہونچ سکتی وہاں ہوا قائم اور دائم ہے۔ ذرا بھی کہیں خلاء پیدا ہو جائے تو ہوا کو آتے دیر نہیں لگتی پانی کو بھی لاؤ تو نالی بناؤ نشیب پیدا کرو اور پھر بھی اس کی نقل و حرکت میں تدریج لیکن ہوا کو نہ نشیب کی ضرورت نہ فراز کی جگہ ہوئی اور وہ دفعتہً آئی گویا پہلے سے موجود تھی غرض ہوا لطیف تر تھی تو قوی تر اور غالب بھی ہوئی جو تمام عناصر پر حکمراں سب سے بالا و فوق اور پھر سب میں ساری و جاری ہے۔

جامع العناصر انسان اور اسکی طاقت

لیکن اگر ان سارے عناصر اور اُن کے تینوں موالید اور موالید کی بھی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر تنہا انسان کو ایک طرف رکھو تو نظر آتا ہے کہ انسان ان سب ہی سے زیادہ اشد اقویٰ اور ان پر غالب و متصرف ہے یہ سب عناصر اپنی کارگذاری میں اُس کے محتاج اور اُس سے مغلوب ہیں لیکن وہ ان میں سے کسی کے زیر تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں کیونکہ اولاً تو :-

(۱) عناصر کی یہ باہمی اور نسبتی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آ نکے کھلتی ہے اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔ لوہا خود بخود پتھروں کو کچلتا نہیں پھرتا آگ جگہ جگہ لوہے کو خود گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا۔ ہوا کی یہ جزوی متصادم حرکات خود بخود نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کے کئے ہوتی ہیں وہی کدالیں بناتا ہے اور پتھر توڑتا ہے وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیالات کو اڑاتا ہے۔

پس عناصر کی یہ متغلبانہ کارفرمائی بہت حد تک انسانی افعال کی دست نگر ہے اگر انسان ان میں دخل نہ دے تو عناصر اربعہ اپنے خزانوں میں پڑے ہوئے جیسے چاہیں اینٹھتے رہیں لیکن میدان مقابلہ میں پہونچکر ان جزوی افعال میں اپنا تغلّب نہیں دکھلا سکتے۔ پس جس پر کسی غالب کا غلبہ موقوف ہوا اور جس پر کسی قوی کی فتح و نصرت معلّق ہو ظاہر ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہوگا۔ اور اُس کی رشدّینہ کی یہی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

عناصر میں انسانی تصرفات

(۳) پھر یہی نہیں کہ انسان ان کی باہمی نسبتہ کھولدینے ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ نہیں بلکہ ان کی یہ تمام طاقتیں بھی اُس کے پنجۂ تصرف وتسخیر میں قید ہیں زمین کا قلب و جگر چاک کر دیا کنوئیں بنائے راستے بنائے تہ خانے تیار کئے ارضی معدنیات سرمہ۔ ہڑتال۔ سونا چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے اُس سے چھین لئے پہاڑوں کو تراشکر تہ بر تہ مکانات بنائے پہاڑوں کی ٹھنڈی اور برفانی چوٹیوں کو جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی اپنی بستی بنا کر ان میں راستے نکالے انہیں برما کر سرنگیں بنائیں اُن میں اپنی سواریاں دوڑائیں۔ وتنحتون من الجبال بیوتاً زمین کے خزائین ودفائن کا راز فاش کر کے اثقال زمین کو عالم آشکارا کر دیا اور زمین اور اس کے اجزا سے برابر چاکروں اور غلاموں کی سی خدمت لیرہا ہے پانی کو جو زمین کی تہ میں سے اُسے کھوج نکالا کنوئیں کھود کر ڈول رسّی کے جال سے اسے پکڑا نل لگا کر سیکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے مکانات

ٹھنڈے کئے پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے جمنا اور گنگا جگہ جگہ ماری پھرتی ہے آبِ واٹر ورکس کے ذریعہ گھر گھر رسوا کیا وہ مائی تھی تو جگہ جگہ اس بچہ نے اُس سے گوموت دہلوا کر چھوڑا۔ پانی جیسا آزاد عنصر ٹنکیوں میں قید نلوں میں بند اور نکلنے میں ہوا کی حرکت کا محتاج یہ سب اس انسان کی تسخیر کا نتیجہ ہے۔ وہ غریب اپنے طبعی میلان سے نیچے کو جاتا ہے یہ اُسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پٹک دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کر اُسے جما دیا کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا کبھی اُسے برف دکھا کر یخ بنا دیا کبھی آگ دکھا کر گرما دیا غرض وہی پانی جس سے آگ جیسا قوی عنصر بھی پناہ مانگتا تھا انسان کے سامنے ایسا بے بس اور بے یار مددگار ہے کہ اُسے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔

پانیوں کا سب سے بڑا گھر اور ابوالمیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا رُبع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ پیکر موجوں کا لگاتار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرۂ زمین کو نگل جائیگا باایں ہیبت و عظمت بھی انسانی دست و بُرد سے نہ بچ سکا انسان نے سمندروں کے جگر چیر ڈالے اُس میں جہاز چلائے تار دوڑائے آبدوز کشتیوں سے اُس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا اُس کے مدفون موتیوں کے خزانے اگلوا لئے اُس کی تہ کی چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں رسوا ہو رہی ہیں خود سمندر کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا اُس کا نمک الگ کر دیا اور رطوبت الگ۔ گویا پانی کا خون تک پی گیا۔ اور پھر اس سب کے ٹکے الگ کر لئے غرض یہ قوی تر پانی زمین کی تہ میں جا کر چھپتا ہے تو اُسے پناہ نہیں پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو اوس کے لئے رستگاری نہیں مجبور بھی ہے اور قید بھی۔ پھر ذلیل سے ذلیل خدمتیں اُس سے لیجا رہی ہیں۔ نجاستوں کا دہونا ظروف صاف کرنا میلے کپڑے پاک کرنا

وغیرہ اس کے سر ہیں جس سے اندازہ کر لیا جائے کہ انسانی طاقت نے کس درجہ اس لطیف عنصر کو اپنا غلام اور پابند قیدی بنا لیا ہے۔

آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو تو وہ بھی انسان کے سامنے ایک خاکسار غلام کی طرح مجبور ہے وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی تو انسان نے آتشی شیشوں کے ذریعہ اسے گرفتار کیا اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ایک ذرا سی دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا کہ جب چاہا دیا سلائی کا سر رگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا گویا وہ آگ جو سر نیچا ہی نہ کرتی تھی انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی وہ رفعت و تعلی سب خاک میں مل گئی کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے کہیں انگیٹھیوں میں محبوس ہے کہیں اُس کا تزکیہ نفس کیا تو آگ کا گیس بنا دیا جس کا دھواں اور دخان سب رخصت ہو گیا غرض آگ کا عنصر بھی انسان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے کہ جب چاہا اور جس طرح چاہا الٹ پلٹ کر دیا جسے کسی حالت میں بھی چین نہیں۔

ہوا بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پا سکی تھی مگر اس کی یہ پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے اُسے نہ بچا سکی اور اس اُڑتے ہوئے پرندہ کو بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں انسانوں کے جہاز اوڑ رہے ہیں اور ہوا اپنے کندھوں پر انہیں سوار کئے پھر رہی ہے۔ ہوا کیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا ہے جس پر بے لگام اُس نے سواری کس رکھی ہے۔

انسانوں کی خبر رسانی کی خدمت پر جدا مجبور ہے۔ مشرق سے مغرب تک انسانوں کے افسانے دوڑ رہے ہیں اور ہوا اپنی مخفی طاقتوں سے انہیں لئے پھر رہی ہے گویا انسان کی ایک چٹھی رساں ہے جو بلا اُجرت غلامی کر رہی ہے۔ ادھر برقی پنکھا

کو حرکت میں لانے کے لئے جدا ناچ رہی ہے تاکہ انسان کا پسینہ خشک کرنے کی خدمت انجام دے غرض خدمت گذاری کے فرائض میں چاکروں کی مانند مصروف ہے اور چون وچرا نہیں کر سکتی پھر انسان اُسے قید کرنے پر اترا تو موٹروں کے پہیوں میں وہ بند سائیکلوں کے ٹائروں میں وہ قید پیٹرا پیر گنوں میں وہ گرفتار ربڑ کی گیندوں میں وہ محبوس غرض یہ نادیدہ طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا پھنسی تو ایسی پھنسی کہ انسان کے ہاتھ میں ایک قیدی محض بنکر رہ گئی جس کا کوئی پرساں حال نہیں۔

عناصر میں انسانی ایجادات

(۳۳) پھر اس ظالم انسان کو اسی پر قناعت نہیں کہ عناصر کو باقی رکھکر ہی ان سے کام لیتا رہے نہیں اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں انہیں فنا کر کرکے اور انہیں باہم لڑا لڑا کر بھی ان سے نئی نئی چیزیں عالم آشکار اکرتا رہتا ہے تاکہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کرکے آگ کو دہونکا دیا آگ تو جوش میں پانی کو اوڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے دونوں اپنی جگہ غیظ و تیظ میں ہیں اور انسان اُن کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا کرکے انجن اور مشینین چلا رہا ہے لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ رہا ہے۔ مِل چل رہے ہیں مشینیں گھوم رہی ہیں انجنوں میں کوئلہ کی کانیں پھنک رہی ہیں آ مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے گویا ساری کائنات پچلی جا رہی ہے کٹ رہی ہے اور مٹ رہی ہے مگر اُف نہیں کر سکتی کہ ایک انسان کا بچہ مشینین

کی کل دبائے کھڑا ہے جس کی ایک انگلی کی حرکت سے عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ پر یہ طوفان بپا ہو رہے ہیں۔

پھر پانی کو پانی سے ٹکرایا اور برق پیدا کر لی گویا پانی میں آگ لگا دی پھر وہ بجلی جو سکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی اور آسمان زمین ایک کر ڈالتی ہے اُسے تانبے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ باایں زور و طاقت اس گرفت سے باہر نہیں جا سکتی ایک ذرا سی پیتل کی گھنڈی جسے سوئچ کہتے ہیں اُس کا قفل ہے اُسے نیچے کو دبا دو تو بجلی آموجود اور اوپر کو اُٹھا دو تو غائب۔ گویا برقی روکی ایک عظیم الشان فوج ایک دُبلے پتلے سپاہی کی قید میں گرفتار ہے اور وہ پوری فوج اس ایک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی پھر یہ مصنوعی ہی بجلی نہیں آسمانی بجلی کی گرفتاری کے لئے بھی انسان ہتکڑیاں اور بیڑیاں لئے تیار ہے بڑی بڑی بلڈنگوں پر چھپے تار جڑے ہوئے ہیں کہ اگر یہ جہاں سوز بجلی عمارت پر آپڑتی ہے تو یہی معمولی سا تار اُسے اوچھا لیتا ہے اور وہ عمارت کو ذرہ برابر آنکھ نہیں دکھا سکتی بلکہ اُس تار میں غلطاں پیچاں ہو کر رہ جاتی ہے۔

پٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگا دی۔ آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہا ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے ہوائی جہاز اُڑ رہے ہیں۔

غرض ساری کائنات کا ناک میں دم ہے ایک مشت استخواں سے کائنات کا ذرہ ذرہ عاجز ہے عناصر نے باہم اپنی طاقتوں کے کیا جوہر دکھلائے تھے جو اس مجموعہ عناصر نے کر دکھایا۔ بحر و بر اور خشکی و تری کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے کہ اُسے کسی وقت چین نہیں۔ اور

انسان ہے کہ رات دن ان عناصر کے الٹ پھیر میں ان تھک طریق پر لگا ہوا ہے
جس سے ساری کائنات کا دم بند ہے اور سارے ہی جماد و حیوان قید غلامی
میں مقید ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے خورد سال بچہ کو نصیحت کی تھی
کہ انسان سے بچتے رہنا یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ وہ انسان کے شوق دید میں تھا کچھ
شعور پا کر انسان کی تلاش میں نکلا کہ دیکھوں آخر یہ ہے کیا بلا جس سے سلاطین
صحرا بھی اپنے دار السلطنت میں سہم کر کپکپاتے ہیں۔ چلا تو پہلے اتفاق سے گھوڑے پر
نظر پڑی جس کی جسامت اور پھرتی و چالاکی دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ ہی
انسان ہے پوچھا تو گھوڑے نے کہا کہ مجھ بے چارے کی کیا مجال ہے کہ میں انسان
کے سامنے ٹھہر سکوں چوبیس گھنٹے گلے میں رسّی پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا
جیل ہے اور جب حضرت انسان کا جی چاہا تو میری پیٹھ پر سوار منہ میں لگام اور
اوپر سے تڑا تڑ کوڑوں کی مار جیسی مجھ پر گذرتی ہے میں ہی جانتا ہوں۔ شیر کا بچہ
سہم گیا کہ یا اللہ انسان کیا بلا ہے کہ عناصر ہی نہیں موالید بھی گرفتار بلا ہیں۔ آگے
بڑھا تو اونٹ نظر پڑا جو گھوڑے سے دوگنا اور عجیب الخلقہ تھا اسے یقین آگیا کہ
ہو نہ ہو یہی انسان ہے کہ یہ گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے اُس سے دریافت
کیا تو اُسے بھی انسان سے دوہائی دیتے ہوئے سنا وہ بولا کہ میرے اس قد و
قامت پہ نہ جاؤ انسان نے بایں جسامت و ضخامت میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے میں
کیا مجھ جیسے سینکڑوں میرے بھائی بند صرف ایک نکیل میں گرفتار اور ایک
خورد سال بچہ ہمیں جنگل در جنگل لئے پھرتا ہے منوں بوجھ کمر پر ہے ہم بلبلاتے
ہیں مگر شنوائی نہیں انسانوں کے لئے ہماری گردنیں سیڑھیاں ہیں جب چاہتا
ہے کمر پر دوہرا جاتا ہے پھر ایک نہیں دو نہیں تین تین آدمی لد جاتے ہیں اور نہ صرف
خود ہی لدتے ہیں بلکہ بڑے بڑے پلنگ ہماری کمروں پر کس کر براجمان ہوتے ہیں

ہم چُپ چاپ کان دبائے منزلیں قطع کرتے رہتے ہیں راتوں چلتے ہیں اور دنوں بلبلاتے ہیں مگر کوئی مخلص نہیں نکلتا غرض ہماری یہ ساری مصیبت و غلامی صرف اسی انسان کی بدولت ہے بھلا ہم انسان تو کیا ہوتے ہم تو اُس کا نام بھی بے خوف ہو کر نہیں لے سکتے۔ شیر کا بچہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا کہ خدا جانے انسان کیسے ڈیل ڈول کی چیز ہو گی جس سے ایسے ایسے عظیم الخلقت جانور پناہ مانگ رہے ہیں آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی پر نظر پڑ گئی جو ایک عظیم الشان بلڈنگ کی طرح سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا جس کی عمارت چار موٹے موٹے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی اُسے یقین محکم ہو گیا کہ یہ بالضرور انسان ہے اور یہی ایسی ہستی ہے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر غالب آ سکتی ہے اُس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے کہا کہ غالباً جناب ہی کا نام نامی انسان ہے؟ ہاتھی نے نہایت حیرت سے بچہ شیر کو دیکھ کر کہا کہ بیٹا تم ناسمجھ ہو کس بری بلا کا نام لے رہے ہو مجھ بلیے لے ڈول کی جو گت اس ظالم انسان نے بنائی ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ گھوڑے کے منہ میں لگام تو دیدیتا ہے اونٹ کی ناک میں نکیل تو پہنا دیتا ہے۔ لیکن مجھ پر تو بے ڈھانٹی سوار ہوتا ہے لگام میرے نہیں نکیل میرے نہیں مگر پھر بھی میں ایسا گرفتار اور مجبور محض ہوں کہ اس ظالم کے آگے چوں تک نہیں کر سکتا ہر وقت میری گردن پر سوار لوہے کا انکس ہاتھ میں ذرا چوں کروں تو سر پر اتنے پڑتے ہیں کہ کھایا پیا بھول جاتا ہوں میری کیا مجال ہے کہ اس انسان کے سامنے اُف بھی کر سکوں میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل پیرا رہیں اور اپنی جنگل کی بادشاہت کی حرمت کو قائم رکھیں اس انسان کے قریب بھی نہ پھٹکیں ورنہ یہ شاہزادگی ساری کرکری ہو جائے گی اور پھر کوئی فریاد کو بھی نہ پہونچے گا۔ شیر کا بچہ حیران تھا کہ انسان آخر کس تن و توش کا ہو گا جس کے غلبہ اور تسلط کا چار دانگ عالم میں یہ شہرہ اور

شور نشور برپا ہے آخر کار اُس نے بے نیل مرام واپسی کا قصد کر لیا۔ لوٹ رہا تھا کہ ایک بن میں ایک بڑھئی کے بچہ کو دیکھا کہ وہ ایک بڑے شہتیر کو آرے سے چیر رہا ہے اور جتنا چیر چکا ہے اُس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی ہے بچۂ شیر کا التفات بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہی انسان ہے لیکن پتہ لینے کے لئے اُس سے سوال کیا کہ کیا جناب انسان سے واقف ہیں ؟ اُس نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے کہا میں اُس کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے کہا بندہ ہی انسان کہلاتا ہے شیر نے حقارت و تعجب سے دیکھ کر کہا ارے کیا تو ہی وہ انسان ہے جس سے شیر گھوڑا اونٹ ہاتھی سب لرزتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ جی ہاں واقعہ تو یہی ہے بچۂ شیر نے کہا کہ او دشمن تو ہے کیا مال ؟ تیرا کام تو میں ابھی اپنے ایک طمانچہ سے ختم کئے دیتا ہوں بڑے ہی بے وقوف میرے آبا و اجداد تھے جو تجھ سے کانپتے رہے اور بڑے احمق وہ تھے جنہوں نے راستہ میں مجھے خواہ مخواہ سہما دیا اس لاف زنی کے ساتھ بچۂ شیر آگے بڑھا تاکہ قوۃ آزمائی کرے۔ بڑھئی کے بچہ نے سمجھ لیا کہ وقت آ برابر ہوا۔ اب تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہا کہ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں میں بے چارہ کیا چیز ہوں آپ جو چاہے فرمائیں۔ اس وقت میرا ایک کام درپیش ہے جسے میں اپنے ضعف کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا خدا نے آپ جیسا قوی اور بہادر بھیج دیا پہلے وہ کام کر دیجئے اور پھر میری ساتھ جو چاہئے سلوک فرمائے اور وہ یہ ہے کہ اس شہتیر میں سے میں یہ کھونٹی سرکانا چاہتا ہوں ذرا آپ اپنا ہاتھ اس شہتیر کے شگاف میں ڈالکر اُسے تھام لیجئے تاکہ میں کھونٹی سرکا دوں۔ شیر صاحب اس مدح و ثناء سے مسحور ہو کر بے تکلف آگے بڑھے اور ایک نہیں دونوں ہاتھ شگاف میں ڈالدیئے بڑھئی کے بچہ نے کھونٹی نکال لی کھونٹی کا نکلنا تھا کہ شہتیر کے دونوں پٹ مل گئے اور شیر صاحب کے دونوں ہاتھ اُس میں پھنس کر رہ گئے۔ اب شیر صاحب نے

تو چین چین کرنا شروع کیا اور بڑھئی کے بچہ نے ہنسنا شروع کیا کہ فرمائیے انسان کو دیکھ لیا۔؟ اس وقت شیر نادم ہوا کہ واقعی تجربہ کاروں اور بڑوں کی نصیحت سے روگردانی کرنے کا انجام بُرا ہوتا ہے مگر پھر سوچنے لگا کہ ظاہر میں تو یہ انسان نہایت ہی کمزور اور حقیر ہے اس کا جثہ تو قطعاً طاقتور نہیں معلوم ہوتا ہاں کوئی اندرونی طاقت ہے جس سے اس نے مجھے اس وقت بے بس کر دیا اور ساری کائنات کو پچھاڑ رکھا ہے۔

یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے بس کرتی ہے ان مشاہدات کی رُو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں بڑھکر طاقت موجود ہے جب ہی تو وہ ایک چھوٹے سے جثہ میں کم سے کم ہونے کے باوجود بھی عناصر کے مخزنوں اور موالید کے جتھوں پر بھاری ہو رہا ہے اور انہیں غلبہ کیساتھ ہر قسم کے تصرفات اور حاکمانہ کارروائیاں کرنے میں کسی سے مغلوب نہیں اور جب یہ مان لیا گیا تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُس میں لطافت بھی عناصر سے کہیں زیادہ موجود ہے کیونکہ پہلے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے کہ طاقت درحقیقت لطافت ہی میں ہے کہ کثافت میں بجز ضعف و درماندگی کے اور کچھ نہیں پس انسان میں جب ہوا سے بھی زیادہ طاقت ہے جو الطف العناصر تھا تو ناگزیر ہے کہ اُس میں لطافت بھی ہوا سے کہیں زیادہ ہو تاکہ وہ اُس پر اپنی یہ طاقتور حکمرانی برقرار رکھ سکے۔

انسانی طاقت و تسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے

مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کے ظاہر میں تو کوئی لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی نہ وہ صیقل شدہ آئینہ یا صاف پانی کی سی چمک رکھتا ہے کہ اُس میں منھ نظر آنے لگے۔ نہ وہ خود ہی ایسا روشن ہے کہ فضا میں اُس سے شعاعیں پھوٹتی ہوں۔

اور روشنی نکلتی ہو نہ وہ ہوا کی طرح غیر مرئی ہے پھر اس میں یہ لطافتوں کو زیر کردینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طاقت اور لطافت اسکے بدن کی نہیں ہو سکتی۔ کہ بدن تو وہی آگ پانی ہوا مٹی کا مجموعہ ہے اگر اس میں کوئی طاقت بھی ہو تو پھر بھی وہ بے چارہ اس تھوڑے سے آگ پانی سے سارے جہان کے اس آگ پانی پر کیا غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔ کہ یہ بدنی آگ پانی تو خود آفاقی آگ پانی سے لیا ہوا ایک قلیل سا جزو ہے۔ اور جزو قلیل اپنے کل پر کیا غالب آسکتا ہے؟ ایک قطرہ دریا کو کیا مغلوب کر سکتا ہے؟ ایک چنگاری کرۂ نار پر کیا تسلط جما سکتی ہے؟ ایک ذرہ کرۂ ارض پر کیا حکومت کر سکتا ہے؟ بلکہ اس صورت میں تو قصہ برعکس ہونا چاہئیے تھا کہ یہ مادی جہاں خود اس انسان پر ہر حیثیت سے غالب رہتا اور اُسے دم بخود رکھتا چہ جائیکہ اس مشتِ خاک سے ساری کائنات آب و گل مسخر ہو جائے اور خود اُسی کا دم اس ضعیف البیان کے سامنے بند ہو؟ پس یہ تسخیر یقیناً اس کے بدن اور بدنی آب و آتش یا ہوائی لطافت کا کام نہیں ہو سکتی بلکہ انسان کی یہ غلبہ پانیوالی قوۃ بلاشبہ ایسی ہونی چاہئیے جو آگ پانی تو کیا؟ ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے اس کی لطافت وہ ہو کہ باوجود انسان کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہونے کے کبھی اُس کا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو بلکہ کبھی اُس کے لمس و مس تک کا بھی اُسے احساس نہ ہوا ہو وہ متصل تو اتنی ہو کہ انسان اُس سے ملے بغیر اپنی ہستی کو باقی نہ رکھ سکے اور منفصل ایسی ہو کہ انسان کے کسی حاسہ کی رسائی اس تک نہ ہو۔ خود اُس پر کوئی سرد و گرم نہ پہونچ سکے! اس لئے وہ فقط اپنے بدن ہی پر نہیں بلکہ جہاں کے عناصر اربعہ پر غالب آجائے اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کونسی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کی یہ صفات

ہوں۔ کہ ان دو ہی سے انسان مرکب ہے جب ایک میں

روح انسانی کی لطافت اور حسّی نورانیت

یہ کرشمے ہیں تو دوسرے ہی جز و میں ہو سکتے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ رُوح عناصر اربعہ ہی نہیں تمام مادّی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے کہ پھر رُوح کی یہ لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہی ہیں بلکہ حسّی طور پر بھی اُس کی لطافتیں عالم آشکارا ہیں خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں تھیں اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب رُوح میں جمع ہیں۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اوتار لیتا تھا تو انسان کی آنکھوں کو روح نے ایک ایسی چمک دے رکھی ہے کہ جدھر اُٹھ جاتی ہے اُدہر کے تمام نقشے اور فوٹو اور سینریاں اپنے اندر اُتار لیتی ہے آئینہ کا فوٹو تو بے اصل محض ہے کہ پشت آئینہ خالی ہے لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں کہ اُس کے پیچھے حسِّ مشترک میں اُس کا پورا مصوّر علم قائم ہے۔

اگر آگ سے تار شعاع پھیلتے ہیں تو آنکھوں سے تار نگاہ منتشر ہوتے ہیں۔ جو ان شعاعوں سے کسی طرح کم نہیں کیونکہ تار شعاع سے تو چیز کی صورت محض آنکھ ہی کے سامنے روشن ہو جاتی ہے اور تار نگاہ سے یہ سب چیزیں دل کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جو ان کی حقیقت پر بھی غور کر سکتا ہے۔

اگر پانی غایت لطافت سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے اور سخت سے سخت جسم بھی اس کے سریان سے نہیں بچ سکتا جبکہ اُس سے اتصال قائم ہو جائے تو روح بھی جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہوتی ہے حتیٰ کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اُس سے تازگی لئے ہوئے ہوتی ہیں پھر پانی تو اپنے سریان سے اپنے محل کو

محض ٹھنڈا ہی کئے ہوئے رہتا ہے اور روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اگر ہوا غایت لطافت سے دکھلائی نہیں دے سکتی تو روح بھی اپنی لطافت بے غایت سے آج تک نادیدہ ہے اور جیسے ہوا کا رنگ و بو غیر محسوس ہے یا ہے ہی نہیں ایسے ہی روح بھی ان خواص سے بری ہے۔

غرض عناصر میں لطافت کے جو جو کمالات اور لطافت کے جس قدر مراتب ودرجات تھے وہ سب روح میں موجود ہیں اس لئے اگر عناصر کو حق تعالیٰ سے جزوی مناسبتیں تھیں اور اس بنا پر وہ قوی تھے تو روح کو بحیثیت مجموعی اس سے یہ ساری ہی مناسبتیں قائم ہیں اس لئے وہ عناصر سے زیادہ قوی ہونی چاہیئے اور جو کام عناصر کر سکتے ہیں وہ سب اس سے بے تکلف سرزد ہو جانے چاہئیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ عناصر کو تو ان کی طاقتوں کی بنا پر درجہ بدرجہ اشد کہا جائے اور روح کو اشد ترین نہ کہا جائے اس لئے عنصری اور مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لیجانے کی ایک یہی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان کی ساری لطافتوں کی جامع ہے۔ اور انہیں ذات بابرکات سے جزوی مناسبتیں ہیں تو روح کو کلی مناسبت ہے۔

روح انسانی کی معنوی لطافت وطاقت

لیکن اگر مزید غور کرو تو روح کو حق تعالیٰ سے محض عناصر ہی کی سی مناسبتہ نہیں یا بالفاظ دیگر محض مناسبتہ ہی نہیں بلکہ ایک جہتہ سے ایسی مماثلت بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے مخصوص اوصاف وکمالات کے لئے بطور مثال پیش کیجا سکتی ہے اور عناصر اس کے لگ بھگ بھی نہیں رہ سکتے کہ وہ سرے ہی سے ان کمالات

سے عاری اور کورے ہیں مثلاً اگر حق تعالیٰ غیر مرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم اور
مدبر ہے تو اسی طرز پر رُوح کائنات بدن کی قیوم اور مربی ہے۔ وہ ذرا اپنی توجہ
ہٹالے تو کائنات بدن درہم برہم ہو جائے جیسا کہ موت کے وقت ہو جاتا ہے
پھر جس طرح حق تعالیٰ کے انوار ساری کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ
افروز ہیں اور ہر ہر خطہ اور اُس کے ہر ہر جزو سے اس کے مناسب کام لیر ہے ہیں
اور باوجود اس ظہور تام کے پھر بھی آج تک کسی آنکھ نے اُسے نہیں دیکھا اسی
طرح روح کے انوار بدنی کائنات میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر ہر عضو سے
اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجودیکہ بدن کی رگ رگ میں روح کا
ظہور ہے۔ آنکھ کی چمک میں رخسار کی سرخی میں بالوں کی سیاہی میں دانتوں کی
سفیدی میں بدن کی تازگی میں اُسی کا جلوہ ہے وہ نہ ہو تو یہ سارے جلوے ایک
آن میں ختم ہو جائیں۔ مگر باوجود اس ظہور تام کے پھر بھی آج تک ایسی نادیدہ ہے
کہ خود اپنا نفس بھی اُس کے دیدار سے محروم ہے ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار
اُس پہ گھونگٹ یہ کہ صورت آجتک نادیدہ ہے

پس جیسے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ایسے ہی رُوح ظاہر بھی ہے اور
باطن بھی۔

پھر جس طرح اس ساری کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل و حرکت
سے ذات حق اول اور اقدم ہے کہ وہی تو معطی وجود ہے اور وجود سے پہلے کوئی
بھی اقدام ممکن نہیں۔ آپ عالم کا کوئی اقدام ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ وہ ہو جائے
اور ذات حق تعالیٰ اُس کے بعد آئے اُس کے بغیر تو کائنات کی زندگی ہی نہیں
اور بلا زندگی اس کی کوئی نقل و حرکت ہی ممکن نہیں تو مخلوق خالق سے پہلے کیسے

ہوسکتی ہے؛ ضرورت ہے کہ ہر مخلوق اور مخلوق کے ہر فعل سے خالق کی ذات مقدم ہو
پھر اسی طرح کائنات کی ہر نقل و حرکت کا منتہٰی بھی اُس کی ذات ہے۔ آپ عالم کا
کوئی اقدام بھی ایسا پیش نہیں کرسکتے کہ وہ ذات حق سے گذرتا ہوا آگے پہنچ جائے
اور ذات کو ادہر ہی چھوڑ جائے کیونکہ جب ذات حق ہی سے اس کائنات کی زندگی
قائم ہے تو یہ دعویٰ ایسا ہوگا کہ کائنات اپنے افعال کرتی ہوئی زندگی کی حد سے
گذر جائے اور پھر بھی اُس کے افعال جاری رہیں جو عقلاً ناممکن ہے پس عالم کے
ہر حرکت و سکون کا منتہٰی بھی اُس کی ذات نکلتی ہے اُس کے آگے اور بعد کچھ نہیں وہی
ہر چیز کا اول بھی ہے اور وہی آخر بھی جیسے کہ وہی ظاہر تھا اور وہی باطن بھی ٹھیک
اسی طرح بدنی کائنات کی ہر نقل و حرکت بلکہ اُس کی نفس ہستی ہی سے رُوح اول بھی
ہے اور آخر بھی کیونکہ جب رُوح ہی بدن کے لئے باعث ہستی و حیات ہے تو کسی
زندہ کا کوئی اقدام زندگی سے قبل کیسے ہوسکے گا پس ہر کام بلکہ بدن کے ہر کام کے
اول رُوح آتی ہے۔ اور اسی طرح جبکہ روح ہی بدن کے لئے باعث حیاۃ ہے
تو کائنات بدن کا کوئی اقدام بھی حیاۃ سے مؤخر نہیں ہوسکتا بلکہ آخر اور منتہائے
حیاۃ ہی رہیگی پس روح ہی اس بدنی عالم کے لئے اول بھی ہوئی اور وہی
آخر بھی جیسے کہ وہی ظاہر تھی اور وہی باطن بھی۔

پھر جیسا کہ ذات حق عالم سے متصل تو اتنی ہی کہ اقرب الیہ من حبل الورید اور
وھو معکم اینما کنتم اور پھر منفصل بھی اتنی کہ ورا ء الوریٰ ثم وراء الوریٰ مخلوق ظلمۃ محض
اور وہ نور مطلق ع۔ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ ٹھیک اسی طرح
رُوح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کوئی ذرہ وال حصہ بھی اُس
سے الگ نہیں ورنہ زندہ نہ رہے لیکن دور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے
کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ۔ کجا یہ مشت

خاک اور کجا وہ جوہر پاک چراغ مردہ کجا نور آفتاب کجا؟

صفات روح سے الٰہیات پر استدلال

ان مماثلتوں کے سبب جس طرح ہم تشبیہ کے سلسلہ میں اُدھر سے اِدھر آئے
اِدھر سے اُدھر بھی جا سکتے ہیں یعنی اپنی ہی روحانی کائنات کے ذریعہ حق تعالےٰ کی
ذات وصفات کی یکتائی اور بے چونی پر استدلال بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں
کہ جس طرح یہ ہماری بدنی کائنات بلا اس غیر مرئی مدبر یعنی روح کے موجود اور
باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ ساری کائنات عالم بھی بلا کسی مدبر حکیم کے موجود یا بقا
پذیر نہیں ہو سکتی پس روح کی بدولت وجود صانع پر ہمارے ہی اندر سے دلیل نکل آئی
پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کر سکتی ہے اگر دو ہوں تو
کائنات بدن فاسد ہو جائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو
انسان نہیں سما سکتے اسی طرح کائنات عالم میں ایک ہی واحد قیوم اور حکیم و مدبر
کی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔ ورنہ لو کان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا کا ظہور ہو جائیگا۔ پس
روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحید صانع کی دلیل بھی پیدا ہو گئی۔
پھر جس طرح بدن کے قعر تک میں گھس جانے سے روح کا کوئی کم وکیف
کوئی لون ورنگ اور کوئی سمت وجہت نہیں دکھائی دے سکتی اسی طرح وہ ذات
بابرکات بھی اس طرح بے چون و بے چگون اور سمت وسمات سے مبرّا اور رنگ
و لون سے منزہ ہے کہ رنگ برنگ کے جلوے تو اُس سے ہیں پر وہ ہر رنگ سے
بری وبالا ہے پس روح کی بدولت اس کی شان تنزیہ وتقدیس بھی ہمارے ہی
اندر سے ہویدا ہو گئی۔
پھر جس طرح روح بدن کے ذرہ ذرہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے

اُس کا تعلق وابستہ ہے مگر تعلقات کی شدۃ و ضعف کا یہ تفاوت بھی نا قابل انکار ہے کہ جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں جو دماغ سے ہے وہ کبد و معدہ سے نہیں اور جو ان سے ہے وہ عام جوارح بدن سے نہیں اسی لئے قلب و دماغ کی ادنیٰ ایذا رسانی یا توہین سے رُوح میں غصّہ و جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ان اعضاء رئیسہ پر ادنیٰ سی ضرب بھی پڑ جانے سے رُوح اپنی حیات کو سمیٹ لے جاتی ہے بخلاف عام اعضاء کے کہ اگر ہاتھ پیر کاٹ بھی دیئے جائیں تو کمال زندگی خواہ چھن جائے مگر نفس زندگی مسلوب نہیں ہوتی اسی طرح ذات بابرکات کا جلوہ جہانوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے مگر مواضع کے تفاوت سے تعلق کی شدۃ و ضعف میں بھی تفاوت بھی وہ ہے کہ جو تعلق اس کی ذات کو عرش عظیم سے ہے وہ اور مقامات سے نہیں۔ کہ وہ مرکز استواء ہے پھر جو تعلق بیت المعمور سے ہے اور سماوی مواضع سے نہیں کہ وہ قبلۂ ملائکہ ہے۔ پھر جو تعلق بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ یا حرم نبوی سے ہے وہ اور جگہوں سے نہیں ہے پھر جو تعلق عام مساجد و معابد سے ہے وہ اور مکانوں سے نہیں ہے اس لئے اگر ان پر کوئی توہینی حملہ یا جارحانہ اقدام ہو تو رُوح اعظم کا غضب بھڑک اٹھتا ہے عالم میں ہیجان شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے حتیٰ کہ بیت اللہ کی اینٹیں اُکھڑ جانے ہی پر اس عالم سے زندگی کھینچ لی جائے گی۔ پس رُوح کی بدولت ہم پر حق تعالیٰ کے تعلقات کی نوعیت بھی منکشف ہو گئی۔

پھر جس طرح ہر شخص اپنی روح کی پکار اور حقانی دعوت کو دل کے کانوں سے بے تکلف سنتا ہے اور اُس کی نصیحتوں کو قلب کے واسطہ سے ادراک کرتا ہے لیکن پھر بھی اُس کے کلام میں نہ لفظ ہیں نہ آواز یہی شان حق تعالیٰ کے کلام کی ہے کہ کلام بھی ہے اُس میں حقائق بھی ہیں اُس میں سماع و اسماع بھی ہے اور

مخصوص افراد بنی آدم (انبیاء علیہم السلام) جو بنی نوع انسانی میں مثل قلب کے ہیں اسے سنتے بھی ہیں پر نہ وہاں الفاظ کی حدبندیاں ہیں نہ الفاظ و تلفظ کی قیود گو ظہور کے بعد مخلوق میں پہونچتے پہونچتے یہ ساری تحدیدات نمایاں ہو جائیں پس روح کی بدولت ہمیں ذات حق کے کلام نفسی اور کلام لفظی کا بھی فی الجملہ ادراک ہوا پھر اگر تم آنکھ بند کر لو تو روح کا دیکھنا بند نہیں ہوتا اور کان بند کر لو تو اُس کے سننے میں فرق نہیں پڑتا بلکہ آنکھ کان بند کر کے تصور کے لامحدود عالم میں ہی روح دیکھنے کی چیزوں کو اور زیادہ بے تکلفی کے ساتھ دیکھتی ہے اور سُننے کی چیزوں کو اور زیادہ بے غائلہ سنتی ہے۔ حالانکہ نہ آواز روح سے ٹکراتی ہے نہ کسی صورت کا رنگ و روغن اور جسم اُس کے پاس پھٹک سکتا ہے ٹھیک اسی طرح وہ ذات بے چون و بے چگون ہر چیز کو سنتی اور دیکھتی ہے مگر نہ وہاں رنگ و روپ اور مادّیت کو قرب نصیب ہوتا ہے اور نہ آوازوں کے نغمے ہی اس کی سمع سے ٹکر کہاتے ہیں پس اپنی ہی روح کی بدولت ہمیں اللہ کی سمع و بصر کی بے کیفی اور بیچونی کا بھی ایک گونہ اندازہ ہوا۔

اُسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیاۃ تو روح کی زندگی سے قائم ہے مگر روح کے لئے کسی اور روح کی حاجۃ نہیں وہ خود اپنے ہی معدن حیاۃ کی ایک موج ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیاۃ سے قائم ہے اور خود اُس کی حیاۃ کے لئے کسی اور ذات کی حاجۃ نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی حیاۃ سے حیٔ ہے جس میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اور اس طرح ہم کو اللہ کی صفۃ حیاۃ کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہو گیا۔ بہر حال روح کو ذات بابرکات سے مناسبتیں ہی نہیں بلکہ فی الجملہ مماثلتیں حاصل ہیں جس سے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات کی مثالیں ہمارے نفوس میں بہم پہونچ گئی ہیں اور ہم اپنے اندر ہی سب کچھ عیاناً دیکھنے پر قادر ہو گئے۔ اسلئے

روح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کچھ نہیں ہوسکتی جو قرآن کریم نے فرمادی کہ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ غرض روح اس ساری تقریر سے ایک لطیفۂ ربانی ثابت ہو جاتی ہے اور جسم محض ایک کثیفہ ظلمانی لیکن جبکہ یہ بدنی عناصر جو عالم خلق کی چیزیں ہیں اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سا لگاؤ پیدا کر کے ایسے قوی ہو سکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے تو خود روح جو عالم امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ بلکہ مماثلت کی گہرائیوں کی کوئی حد ہی نہیں اللہ جل ذکرہ سے اس قوی مناسبت و مماثلت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب و متسلط نہ ہوگی اگر ڈھنگ سے اس کی قوتوں کو استعمال کیا جائے تو کیا پھر یہ کائنات اس کا تحمل بھی کر سکے گی ؟

پس بجزئیہ شبیر کے قول کے مطابق انسان اگر آگ پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کی بدولت نہیں کہ بدن تو وہی آگ پانی کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ یہ بیچارہ قلیل و حقیر بدن اپنے عظیم و کثیر مخزن پر کیا غالب آسکتا ہے۔ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوۃ اور قوۃ کی یہ غیر معمولی کرشمہ آرائیاں درحقیقت اسکی رُوح کی بدولت نمایاں ہو رہی ہیں۔ کہ رُوح کی لطافتوں کی کوئی حد نہیں۔ اور وہ مجموعہ لطافت سفلی و علوی ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ رُوح تمام مادیات اور تمام عناصر سے اقویٰ واشد ہے۔ پس جہاں ذات بابرکات حق نے عالم آفاق میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تاکہ اُس کے کمالات ظاہرہ اور آیات بینہ کا کسی حد تک ادراک و احساس ہو سکے اسی طرح بلکہ اُس سے بدرجہا زائد اپنی مخصوص مثالیں ہمارے انفس میں رکھدیں تاکہ اُس کی شئون باطینہ اور کمالات بطون در بطون تک ہم بقدر استعداد کچھ رسائی پاسکیں۔

سنریہم آیاتنا فی الآفاق و فی ہم عنقریب اُنکو اپنی نشانیاں انکے گرد ولواح

انفسہم حتی یتبین لہم انہ الحق او لم یکف بربک انہ علی کل شیٔ قدیر۔

میں بھی دکھلائینگے اور خود انکی ذات میں بھی یہانتک کہ انپر ظاہر ہو جائیگا کہ وہ حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

غرض مادّی سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں جن کی طرف تمہید میں میں اشارہ کر چکا ہوں دیکھنے میں تو بدن اور بدنی عناصر سے نمایاں ہو رہی ہیں مگر بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ رُوح کا طفیل ہے جس کی مخفی طاقتیں اس چورنگ مادّہ کو نچاتی رہتی ہیں اور مزدور کی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔

رُوح کی طاقتوں کا غلط استعمال

لیکن سوال یہ ہے کہ روح نے اپنے یہ باطنی کمالات صرف کرنے میں جسقدر بھی جدوجہد کی اور ترکیب و تحلیل کے ذریعہ آگ پانی ہوا مٹی کے یہ جسقدر بھی عجائبات موالید ثلاثہ میں نمایاں کئے اُس سے خود رُوح کو کیا نفع پہونچا؟ اور روح کو بحیثیت رُوح اس جدوجہد سے کیا شرف ہوا؟ ظاہر ہے کہ اول تو ان تمام سائنسی ایجادات کا نفع رُوح کو کچھ بھی نہیں صرف بدن ہی کو پہونچا بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا سردی میں آگ کی حرارت گرمی میں پانی کی تبرید برسات میں ہوا کی تفریح بدن ہی کے لئے ہے رُوح تو نہ گرمی کی محتاج نہ سردی کی کہ حرارت و برودت روح کے اوصاف ہی نہیں اسی طرح ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اُڑایا تو بدن کو ورنہ رُوح جیسی لطیف چیز کو اُڑنے کے لئے اس وزنی اور کثیف طیارہ کی حاجت ہی نہ تھی مرنے کے بعد وہ نمعلوم کہاں کہاں اُڑتی ہے۔ تو کون سے ہوائی جہاز اُس کے لئے جاتے

ہیں پھر سوچو کہ خود ہوا کے اوڑنے کے لئے کس ہوائی جہاز کی ضرورت ہے؟ ہوا تو
خود ہی جہاز کو اوڑاتی ہے تو جو روح ہوا سے بھی زیادہ لطیف تر ہے اور جس نے
خود ہوا ہی کو مسخر اور قید کر رکھا ہے بلکہ ہوا کے خلاف طبع اُسے جگہ جگہ اوڑا رکھا ہے
وہ اپنے اوڑنے میں اُس کی کیا محتاج ہوتی ہے؟ اور جب اُس کی محتاج نہیں تو
اُس کے بھی محتاجوں یعنی طیاروں کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی طرح
ریلوں اور موٹروں سے رُوح کو کیا فائدہ ہے؟ ریل و موٹر اپنے وجود و ظہور
میں خود ہی روح کے محتاج ہیں تو رُوح کو اُن کی احتیاج کیا ہو سکتی ہے اس
لئے ان تمام مادّی کرشمہ آرائیوں اور سائنسی ایجادات کا نفع اگر ہو سکتا ہے
تو صرف بدن ہی کے لئے نہ کہ روح کے لئے ریل اور موٹر میلوں منتقل کر سکتے ہیں
تو بدن کو برق اور گیس اگر ضیا رپاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر نہ کہ اُن ارواح پر
جن کے نور سے خود ہی وہ ظہور میں آئے گرامیفون ٹیلیفون ٹیلی گراف اور لاسلکی
وغیرہ اگر منتفع کر سکتے ہیں تو اجسام کو ورنہ رُوح اپنی حقیقی قوتوں کے لحاظ سے ان
اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہو سکتی ہے پس ان تمام اسباب راحت کی راحت
رسانی بدن تک محدود نکلی۔ اور بدن کیا ہے؟ وہی عناصر اربعہ کا مجموعہ اور
آگ پانی ہوا مٹی کا گھروندہ تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات
کے ذریعہ آگ پانی ہی کو نفع پہونچا دیا بالفاظ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی
لیا اور اندر کے آگ پانی کو پہونچا دیا اور اب روح کا کام یہ رہگیا کہ وہ اپنے
علم و ادراک کا سرمایہ آفاقی آگ پانی پر خرچ کرتی رہے اور یہ بیرونی آگ
پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہے یعنی جسم کی خدمت گذاری میں ہمہ وقت
مصروف رہے۔ اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جو ان عناصر
سے لطیف تر اور بالاتر تھی اور جو ان پر حکمرانی کر رہی تھی آپ نے دھوکہ دیکر

اسے جسم جیسی کثیف چیز یا بعنوان دیگر عناصر کا غلام بنا دیا۔ ایک لطیف چیز کو کثیف کے تابع کر دیا اور بتعبیر دیگر آپ نے لطیف رُوح کو خود اُسی کی لطافت مٹانے میں استعمال کیا۔ جو قلب موضوع ہے پس اب اس مسکین رُوح کی مثال ایسی ہو گئی جیسے ایک عالم و فاضل بادشاہ جس سے ملک و قوم کو بڑے بڑے منافع کی توقع ہو۔ اور جس کے حُسن سیاست اور کمال تدبر سے ملک کے رفاہ و بہبود کی ہزارہا امیدیں وابستہ ہوں باوجود اس علم و فضل کے اُس کے مزاج میں کوئی چالاک اور کمینہ غلام دخیل ہو کر رسوخ پالے اور اپنی ذاتی اغراض و منافع میں بادشاہ کو استعمال کرنے لگے اور ملک کا پیٹ کٹوا کر صرف اپنا تنور شکم بھرنے کی فکر میں لگا رہے۔ ادہر بادشاہ غلام کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اُسی کا کہا کرنے لگے وزرار لاکہ سمجھائیں نصائح کریں اور منت و سماجت سے بادشاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں لیکن یہ کمینہ غلام کسی کی نہ چلنے دے بلکہ اور اُلٹا وزرار سے بدظن کر دے اور بادشاہ کے وسیلے ذرائع معلومات کو چہار طرف سے مسدود کر کے صرف اپنے ہی ڈہنگوں پر لگائے گویا زمام سلطنت بظاہر تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہو لیکن حقیقتاً بادشاہ کے پردہ میں یہ کمینہ غلام حکومت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت کا قضیہ برعکس ہو جاتا ہے جو حاکم تھا وہ محکوم ہو گیا اور جو محکوم تھا وہ حاکم ہو گیا۔

اور سب جانتے ہیں کہ ایسی مملکت جس میں کمینے برسر اقتدار آجائیں اور شرفا دھکے کھاتے پھریں دیرپا نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے ملک کے تباہی کے آثار جلد ہی سامنے آنے لگیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بادشاہ معزول کر دیا جائیگا اُس کی امارت و سلطنت چھن جائے گی ادہر آپ خود سمجھ لیں کہ انقلاب سلطنت کے بعد اس کمینہ ملازم کا کیا حشر ہوگا ؟ وہی اس کے وسائل عمل اور اعضار

کارجوان خود غرضیوں میں اس کے ہمنوا اور مددگار تھے خود اُسی کے خلاف گواہی دیں گے اور اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر پہلے خود اُسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ جس سے ہر صورت میں سب سے زیادہ یہی کمینہ گردن زدنی قرار پا جائے گا اور اُس کے لئے ملک کے کسی گوشہ میں پناہ نہ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ روح ایک عالم فاضل فرماں رواہے جس میں محسوسات معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں۔ جو کائنات بدن ہی میں نہیں بلکہ اُس کے واسطہ سے کائنات عالم پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے عقل اوس کا وزیر اعظم ہے اور نقل اوس کا قانون ہے مگر ساتھ ہی اُس کا ایک کمینہ اور بدذات خادم بھی ہے جس کے واسطہ سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ وزرار وعمائد ان کا نفاذ کریں وہ کمینہ خادم یہ بدن ہے جو عناصر اربعہ کا مجموعہ ہے کمینہ اس لئے ہے کہ جس قدر بھی اُس کے اجزار ترکیبی ہیں سب بے شعور لا یعقل جاہل اور بے تمیز ہیں جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں کمینگی کی یہ حالت کہ جوان سے زیادہ محبت کرکے ان کا قرب حاصل کرلے اُسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بنجاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتوں اور پتھر کے دزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانہ تک سجدے کئے جائے لیکن اگر وزنی مورت اُوپر سے آگرے تو پہلے اپنے اسی مقرب پوجاری کا سر پھوڑے گی اُسے قطعاً خیال نہ ہوگا کہ یہ میرا محب اور عبادت گذار بندہ ہے مجھے اُس کا تو سر نہ کچلنا چاہیئے بلکہ میرا یہ معاملہ صرف اُن مسلم بندوں کے ساتھ ہونا چاہیئے جو مجھ سے بعید تر ہیں اور معبودانہ عظمت کو تسلیم نہیں کرتے اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی کسی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے لیکن

جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اُسی کو غرق کرے گی جو اُس سے زیادہ
قرب حاصل کئے ہوئے ہو گا اُسے قطعاً لگانے اور بجھانے کی تمیز نہ ہو گی۔ ایک
مجوسی برسہا برس بھی اگر آتشکدہ میں سربسجود رہے لیکن آگ اُس کی کوئی
اعانت نہیں کر سکتی بلکہ اس کی لپیٹ پہلے اپنے اسی مقرب بارگاہ کو پھونکے گی
ہوا پرست ہزار ہوائی باتوں میں رہیں لیکن ہوائے نفس کے جھکولے پہلے صاحب
ہوا ہی کو غارت کریں گے دوسروں تک نوبت کہیں بعد میں آئے گی۔ آپ تمدن
کے سلسلہ میں ہی دیکھ لیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں وہی
مادیات کے ہاتھوں زیادہ تباہ و برباد بھی ہیں۔ مشینوں کے لپیٹ میں وہی
زیادہ آتے ہیں جو مشنری میں راتدن مبتلائے عمل ہیں ہوائی جہازوں سے
وہی زیادہ تباہ ہوتے ہیں جو اُن سے زیادہ مزاولت اور مقاربت رکھتے ہیں
ڈرینڈ ناٹ اور وزنی آلات جنگ سے انہیں کے لئے زیادہ ختم ہو رہے ہیں
جو ان آلات کے سامنے سربسجود ہیں گیس اور زہریلے ٹنک رائفلیں اور ریوالور
کارتوس اور بارود سے اُنہیں کا خاتمہ زیادہ ہو رہا ہے جو اُن کے عشق میں جان
باختہ ہیں اور کبھی بھی مادیات کے ان روشن آثار کو ادھر التفات نہیں ہوتا
کہ جو ہمارے موجد اور غلام بے درم ہیں اور جنہوں نے اپنی جانوں ہی کو نہیں
ایمانوں کو بھی ہم پر نثار کر دیا ہے کم از کم ہم اُنہیں تو اپنا نشانہ نہ بنائیں اُنہی
کو جا کر تباہ کریں جو بے لگاؤ رہکر ہم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ پس اس سے
زیادہ مادیات کی کمینگی اور سفلہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُنہیں نہ صرف
دوست دشمن ہی کا کوئی بھی امتیاز نہیں بلکہ جو ان کا زیادہ دوست ہے اُس
کے زیادہ دشمن ہیں پھر سفلہ پن کی اسی پر حد نہیں بلکہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ
جو ان کا دشمن ہے اُلٹے اُس کے قدموں میں پڑ کر دعوائے دوستی کرتے ہیں

پس ان کی اطاعت شعاری علم وشعور سے نہیں فاضلہ اخلاق سے نہیں بلکہ جوتے کے زور سے ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ اخلاق کے جہاں میں دباؤ کی اطاعت کو اطاعت نہیں کہا جاتا۔ پس جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت ہو اُن سے مرکب شدہ بدن سے کب کسی خیر کی توقع کیجا سکتی ہے؟ اور ایسے بدن کے لئے اگر کمینہ کا لقب اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

قوائے رُوح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان وخسران ہی

بہرحال اس نالائق اور کمینہ غلام (بدن) نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگا لیا عقلِ دُوراندیش سے بر سرپیکار کر دیا قانون نقل کو طاق نسیاں پر پہنچوا دیا حظوظ نفس کی تحصیل اور عاجل منافع کی تکمیل کے سبز باغ دکھلا کر رُوح کو اُس کے حقیقی حظوظ اور پایدار منافع سے لاپروا بنا دیا اور اس غفلت زدہ رُوح نے اپنی تمام کمالاتی قوتوں سے وہ حظوظ حاصل کرنے شروع کر دئے جن کا نفع فقط اس چورنگ مادہ یا کمینہ غلام ہی کو پہونچ سکتا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ پھل ملا گیا مگر رُوح خالی ہاتھ رہ گئی بلکہ جو کچھ بھی اُس نے حاصل کرنے کا عزم باندھا تھا اُس میں بھی خود اس غلام ہی کی محتاج ہو گئی وہ رُوح جو کمالات ربانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغنا کی اعلیٰ شان رکھتی تھی اور کسی کی محتاج نہ تھی۔ وہ اپنے اُس لایعقل بدن کی محتاج ہو گئی جو ہر جہتہ سے خود اس کا محتاج تھا وہی رُوح جس سے ان تمام وسائل کا رکا وجود تھا وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل ہی کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی اور وہ رُوح جو کبھی مسجود ملائک بنی تھی آج عبد الاسباب بنکر اپنے ہی باندی غلاموں کو سجدے کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام ہو گئی کہ اگر مادّی وسائل اُسکے ہاتھ میں نہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔ اندریں حالات اس رُوح نے اپنی

علمی طاقتوں سے مادّی منافع کا ایک تمدن تو قائم کیا مگر اپنے اُن جوہری کمالات کھو کر جو اُس کے جز و نفس ہوتے اور ہر موقعہ پر اُس کے ساتھ رہتے۔ وہ شہر میں ہوتی یا جنگل میں اسباب کے ہجوم میں ہوتی یا بے وسیلہ جگہ اپنا جوہر نمایاں کر سکتی لیکن یہ غلام اور غلامی پسند رُوح محتاجگی کے اس درجہ پر آگئی کہ اگر شہر میں ہے اور شہر بھی وہ جہاں بجلی سسٹم اور اسٹیم کی طاقت مہیا ہو تو باکمال ہے ریڈیو سے خبر بھی دے سکتی ہے ٹیلیفون بھی کر سکتی ہے ٹیلی گراف سے آواز بھی پہونچا سکتی ہے کیمرہ ہو تو فوٹو بھی اُتار سکتی ہے لیکن اگر وہ دیہات میں ہو جہاں ان مادی وسائل کا وجود نہ ہو یا شہر ہی میں ہو مگر بجلی فیل ہو جائے یا دشمن بڑھکر برقی تاروں کو کاٹ دے تو پھر یہ رُوح اپاہج اور نکمی ہے اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ یہ رُوح اپنے اصلی اور جوہری کمالات لوہے پیتل کے حوالہ کر کے خود کوری ہو بیٹھی جو محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔ حالانکہ رُوح تو وہ تھی جو شئون ربّانیہ کی جامع تھی وہ علم و معرفۃ کا ایک حظّ وافر لیکر آئی تھی۔ وہ لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی اُس کا استغناء اور کمالِ غیرت تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اپنے کسی فعل میں بھی اپنے باندی غلاموں اور ان بے شعور اور اپاہج مادّوں کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ اگر ایک دیہات میں بیٹھکر جہاں نہ بجلی کا فون ہوتا نہ گیس کا خزانہ اگر آواز لگاتی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہونچ جاتی وہ اگر ایسی جگہ نقل و حرکۃ پر آتی جہاں نہ ریل ہوتی نہ موٹر اور طیارہ تو سکنڈوں میں ہزار ہا میل کا سفر طے کر لیتی وہ اگر دیکھنے پر آتی تو ایک تنگ و تاریک کونہ میں بیٹھکر ساری دنیا ہی کی نہیں عرش عظیم تک کی کائنات کا معائنہ کر لیتی۔ زمین اُس کے لئے سمٹ جاتی ہوائیں اُس کے لئے مسخر ہوتیں زمانہ اُس کے آگے سمٹ جاتا و

سیرابی و تری میں دریاؤں کے رحم و کرم کی محتاج نہ ہوتی بلکہ دریا خود ہی اپنی روانی اور طغیانی میں اُس کے اشاروں کو دیکھتے۔ وہ جنگ و قتال میں لوہے اور ہتیاروں کی محتاج نہ ہوتی بلکہ جس چیز پر ہاتھ ڈالتی وہی اُس کے لئے ہتیار ہو جاتی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ یہ مادی اور عنصری آلات جب کہ اس عنصری لطافت پر ایسی طاقتوں کے کام کر سکتے تھے تو رُوح تو نہ صرف ان سب کی لطافتوں کی جامع ہی تھی بلکہ ان سے ہزار ہا گنا بڑھ چڑھ کر لطافتوں کا ایک عمیق خزانہ بھی اور انہی لطافتوں کے سبب اُس مالک الملک کی ذات پاک سے مناسبتہ تامہ رکھتی تھی جو اپنے کسی کام میں وسائل کا محتاج نہیں بلکہ وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں تو ضرور تھا کہ رُوح ربّانی کی شان بھی ایسی ہی ہوتی کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان مادّی وسائل کی محتاج نہ ہو آخر اس کی کیا وجہ ہو کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے اور جو رُوح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے وہ زمین سے ایک انچ بھی بجلی کی مدد بغیر اوپر کو نہ اُٹھ سکے؟ کیا وجہ ہے کہ ایک انجن تو اپنی آگ پانی کی اندرونی طاقت سے مشرق و مغرب کو ایک کر ڈالے اور جو انسان خود انجنوں میں یہ طاقت مہیّا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ ایسی سریعانہ حرکتوں میں ایک قدم بھی نہ ہلا سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تار اور ٹیلیفون کی برقی رو تو ہزار ہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو مشنریوں میں خود بجلی کی روح پھونکتا ہے ایک میل بھی از خود اپنی آواز نہ پہونچا سکے۔

بہرحال اگر مادّیات سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی بطفیل رُوح تو خود رُوح اور روحانیت سے تو ایسے ہی نہیں بلکہ اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر عجائبات کا کارخانہ کھل جانا چاہیئے تھا؟ تاکہ اس غیر محتاج رُوح کے

استغناء و غیرت کا پورا پورا ظہور ہو سکتا۔ ورنہ یہ کیسی اولٹی بات ہے کہ مستعیر تو طاقتور اور مالک کلیتہً ضعیف و لاچار غلام تو حکمران اور بادشاہ مجبور و بے بس۔؟

روحانی طاقتوں کے محیر العقول کارنامے

آپ اسے کوئی خیالی بات یا محض کوئی علمی نظریہ نہ سمجھیں بلکہ حقیقتاً روح جب بھی اپنی اصل فطرۃ پر چلی ہے تو اس سے بلا واسطہ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کر انہیں اپنی روحانیت کے بل بوتہ پر خوب نچایا ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک یا ساریۃ الجبل کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہونچادی حالانکہ اس وقت تک لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر اعلان حج کی ندا دی تو وہ عالم کے گوشہ گوشہ ہی میں نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں گونج گئی حالانکہ وہ کسی مکبر الصوت آلے کے ذریعہ نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازہ کے کھلنے کا تڑاقہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سن لیا جو یقیناً کسی برقی آلے کے ذریعہ نہیں سنا گیا تھا۔

آپ نے جہنم کے قعر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھما کا دنیا ہی میں سن لیا جو ستر برس میں اس کی تہ تک پہونچا تھا حالانکہ یہاں کوئی بھی حسی اور مادی الہٰ صوت استعمال میں نہیں لایا گیا۔

حضور نے حارث ابن ابی ضرار کے فدیہ کے اونٹ اور لونڈیاں مع

تعداد اس کے بتلانے سے پیشتر ہی بتلا دیں حالانکہ وائرلیس کے ذریعہ بعید کی خبریں دینے کی کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نہ ہوئی تھی آپ نے وحی الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی حکم نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ نہ کر لیا جاتا ہو۔ مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید حالانکہ اس وقت ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ جو کی آوازیں جذب کرنے والوں اور ان کے نظریوں کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔

حضورؐ نے مکّہ کے حرم میں بیٹھے ہوئے مسجد اقصیٰ کی محرابیں اور طاق تک دیکھ کر گن دئے حالانکہ اس وقت تک دوربین کی کوئی ایجاد کسی کے حاشیے خیال میں بھی نہ تھی۔

حضورؐ نے غزوۂ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کا مسجد نبوی کے منبر ہی پر سے معائنہ فرما کر حاضرین کو پتہ دیدیا حالانکہ وہاں آج کے آلات خبر رسانی کی کوئی بود و نمود نہ تھی۔

اُس سے آگے بڑھکر صلوٰۃ خسوف میں انہی عرب کی وادیوں میں آپنے جنتہ و نار کا مشاہدہ فرمالیا۔

عرفات کے میدان میں شیطان کو ویل و ثبور کرتے ہوئے دیکھ لیا یوم بدر میں ملائکہ مسوّمین کی فوجوں کے پرے مشاہدہ فرمالئے۔ اور ایک شب تار میں غیبی حقائق یعنی فتن و آلام کے نزول تک کا معائنہ فرمالیا درحالیکہ وہاں مادّی شیشوں کی کوئی دُوربین درمیان میں نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں اُن کے اشاروں پر چلیں حالانکہ آج کے ہوائی جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت کوئی ادنیٰ التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف فضاء آسمانی بلکہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرما لیا حالانکہ وہاں کسی پٹرولی طیارہ کا واسطہ اس سیر میں نہ تھا کہ طیاروں کا یہ تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور طیارے ہوتے بھی تو انہیں آسمانی سیر سے کیا علاقہ ہوتا اس طرح کے ہزار ہا واقعات بطون تاریخ میں منضبط ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے غلام کبھی نہیں ہوئے۔ بلکہ مادیات ہی نے خود اُن کے اشارۂ خم ابرو پر ہمیشہ کام کیا اور اُن کی غلامی کی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصلی شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہ کر اور اُسی کے ساتھ اپنی مناسبتوں اور مماثلتوں کو بحال رکھ کر اپنے کسی فعل میں بھی ان مادیات کی جو اُس سے بدرجہا کمتر ہیں محتاج نہ ہو جیسا کہ اُس کی فطری لطافتوں کا تقاضا ہے اور جس کی متعدد مثالیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات و خوارق سے پیش کی گئیں جن میں ایک لمحہ کے لئے بھی مادہ سے کوئی مدد نہیں لی گئی۔ بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادیات کو روحانیات کے سامنے جھکنا پڑا ہے۔

مادّی تصرف کوئی حقیقی کمال نہیں

بہرحال روحانی اقتدار کے ان ثابت شدہ نمونوں اور خوارق کی ان سچی مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک باکمال روح کا اصلی کمال درحقیقت مادیات سے مستغنی ہونے اور مادی وسائل کی گرفت سے آزاد ہو جانے میں پنہاں ہے ورنہ کسی روح کا مادیات میں مادی وسائل کے ذریعہ تصرفات کر لینا خود روح کا کوئی مخصوص کمال اور ممتاز کارنامہ نہیں ہے۔ یوں تو ایک مادہ بھی مادہ میں بلا

رُوح تصرف کرلیتا ہے۔

کہیں مٹی اور غبار بھی اڑا اڑ کر چند صدیوں میں دریا کو خشکی بنا دیتا ہے رواں پانی نشیب میں نئے نئے نکاس نکال نکال کر بر کو بحر اور بحر کو بر کر دیتا ہے کوہ آتش فشاں پھٹ کر خنک فضاء کو کرۂ نار بنا دیتا ہے ہوائیں چل چل کر تالابوں اور جھیلوں کو خشک کر دیتی ہیں پس مادہ میں تصرف کر لینا اگر کوئی کمال ہے تو یہ کمال تو خود مادی قوتیں بھی کر دکھاتی ہیں جہاں روحانیت کا کوئی توسط نہیں ہوتا پس اگر انسان کی انسانیت ان عناصر سے بدرجہا افضل ہے اور ضرور ہے۔ اور اگر وہ عناصر کے تینوں موالید میں اعلیٰ واشرف ترین نوع ہے اور بلاشبہ ہے تو اُس کا مابہ الفخر یا مابہ الامتیاز کمال وہ نہیں ہو سکتا جو اُس سے ارذل ترین اشیاء سے بھی سرزد ہو سکتا ہو۔ خصوصاً جب کہ رُوح کے یہ تصرفات بھی ان مادیات ہی کے واسطہ سے ہوں گویا رُوح انکی وساطۃ بغیر اُس تصرف پر بھی قادر نہ ہو تو پھر رُوح کے لئے یہ بے کمال ہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا عیب ہوگا۔ کہ اپنے سے ارذل ترین اشیاء کی محتاج بن جائے اور اپنا کمال اُن سے ڈھونڈنے لگے۔ کیونکہ کسی کامل کے لئے عیب کی جڑ استکمال بالغیر ہے جب کہ وہ غیر اپنے سے ارذل اور کمتر ہو ہاں اپنے سے برتر سے استکمال کرنا عیب کے بجائے ایک بہترین ہنر ہے۔ کیونکہ بلا استکمال بالغیر اپنی ذات سے خود بخود باکمال ہونا صرف ایک ذات بابرکات حق کی ہی شان ہو سکتی ہے جو ہر عیب سے منزہ اور ہر کمال کا منبع و مخزن ہے مخلوق کسی حال میں بھی بے عیب محض نہیں ہو سکتی اور بھی کچھ نہیں تو مخلوقیت کا عیب تو اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا جس کی حقیقت عدم اصلی نکلتا ہے اور جبکہ مخلوق ذات کے درجہ میں معدوم نکلی تو ناگزیر ہے کہ درجۂ ذات میں کمالات سے عاری بھی ہو کہ عدم ہی تمام نقائص و عیوب کا منبع ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اُس عیبدار کے باکمال بننے کی اس کے سوا کوئی صورت

نہیں کہ وہ اُسی منبع وجود ذات (یعنی حق جل مجدہٗ) کی طرف رجوع کرکے استکمال کرے جو کمالات کا مخزن اور عیوب سے مبرا ہے نہ یہ کہ حصول کمال کے لئے اپنے سے ارذل ترین چیز (مادّہ) کی طرف جھکنے لگے کہ مادّیت انسان کے لئے نہ مابہ الشرف ہے نہ مابہ الفخر کیونکہ مادّیت تو اُس کی بھی وہی ہے جو گدھے اور بیل کی ہے اس لئے واضح ہے کہ اگر وہ حصول کمال کے لئے اپنے بدن یا مادّیت کی طرف جو مجموعہ عناصر ہے رجوع کرے گو یا آگ پانی ہوا مٹی سے کمال کا جویا ہو تو وہ استکمال نہیں بلکہ ازالۂ کمال اور استحصال نقص ہے کہ اپنے سے ارذل کی احتیاج و غلامی ہے اور گویا سلاطین کا غلاموں کی بندگی کرنا ہے جو خود ایک بدترین اور شرمناک عیب ہے پس اگر سائنس کی حقیقت یہی ہے کہ انسان مادّہ کے ذریعہ مادّوں میں تصرفات کرنے پر قادر ہو جائے تو اس صورت میں انسان آگ پانی کے گھروندہ سے باہر ہی نہیں نکلتا کہ اُسے حقیقی انسانیۃ کا حامل کہا جائے بلکہ ایک ناقص اور عیب دار انسان ثابت ہوتا ہے جس کا عیب بھی حد سے گذر کر شرمناک ہو ورنہ کم سے کم کوئی ایسا ہنر تو کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا جس سے انسانیۃ کی کوئی امتیازی شان ہویدا ہوتی ہو۔

انسان میں محتاجگی کی اصل مادّہ ہے

ہاں اگر مادّہ میں کچھ بھی استغناء کی شان ہوتی تب بھی ممکن تھا کہ اُس کی غلامی سے تھوڑا بہت استغناء ہی ہاتھ لگ جاتا لیکن جب کہ خود اُس کی اصلی اور ذاتی صفۃ ہی محتاجگی اور پابستگی ہے اور گویا مجبوریت ہی اُس کی شان امتیاز ہے تو اُس کی غلامی سے استغناء تو کیا حاصل ہوتا حاصل شدہ استغناء بھی فنا ہو جائے گا۔ اور مجبوری در مجبوری پیدا ہو جائے گی جو تمام ذلتوں کی جڑ ہے

پس رُوح جیسے مستغنی جوہر کا مادّہ جیسے مجبور و محتاج عنصر کی دہلیز پر جھکنا حقیقتاً اپنی امتیازی شان کا فنا کر دینا ہے۔

عناصر اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں

ہاں اب یہ معمہ حل طلب رہجاتا ہے کہ اس چورنگ مادہ میں یہ ذاتی محتاجگی کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر و شر اُس کے طبعی اخلاق سے پھوٹتی ہے اس چورنگ مادّہ کے جبلّی اور طبعی اخلاق ہی سراپا احتیاج و غلامی ہیں اس لئے انسانی نفس جس حد تک بھی مادّہ اور مادّیات کا شغل قائم رکھے گا۔ اسی حد تک محتاجگی اور غلامی کا اکتساب کرتا رہیگا چونکہ انسان کے نفس امّارہ کا نشوونما اور امتزاج انہی عناصر اربعہ سے ہے اس لئے وہ انسان کو پستی و دنائت اور محتاجگی کی طرف لیچلتا ہے جو درحقیقت عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور غالب نکیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آئے تو یہ چورنگ مادّہ اور اُس کے جبلّی اخلاق ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے محتاجگی اور بے بسی کی دلدل سے نہیں نکلنے دیسکتے کہ مادّہ کی خلقت وجبلّۃ ہی بے بسی اور محتاجگی ہے۔

مٹی اور اُس کے جبلّی اخلاق

چنانچہ اولاً مٹی ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے کہ اُس کی جبلّی اور بنیادی خاصیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حسّی خاصیت تو پستی اور تسفّل ہے اور معنوی یا اخلاقی خاصیت قبض اور بخل ہے چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھدی جائے وہ اُسے دبالیگی اور جب تک آپ اُس کا جگر چاک کر کے خود ہی نہ نکالیں نہ دی گی۔ آدم کی اولاد

کے معلوم کس قدر خزانے اور کتنے دفینے اس نے اپنے بطن حرص و آز میں چھپا رکھے ہیں اس کا پیٹ چاک کر کے نکال لو تو نہا ورنہ از خود نہ اطلاع دے گی نہ چیز دے گی آپ زمینی کشت زار کو دیکھ کر اس پر خیال نکریں کہ زمین تو بڑی فیاض ہے جو ایک کے سو کر کے دیتی ہے اور کھیتیوں کے ذریعہ اُس کے جود و سخا کی داستان سنانے لگیں کیونکہ دانہ خود آپ کا ہے جس میں زمین کا دخل نہیں اور اگر وہ زمین سے حاصل شدہ بھی ہے تو وہ بھی کسی ڈالے ہوئے دانہ کا طفیل ہے نہ کہ از خود زمین نے دانے اور بیج کی بھی ایجاد کی ہے اس سے واضح ہے کہ سب سے پہلی اور ابتدائی کھیتی کا بیج یقیناً باہر سے زمین میں ڈالا گیا ہے نہ کہ زمین نے ابتدا کی ہے پس دانہ یقیناً آپ کا ہے نہ زمین کا اس لئے داد و دہش کی ابتدا زمین سے نہیں ہوئی بلکہ انسان سے۔ پھر دانہ ڈالکر اُس کو محفوظ رکھنے بڑہانے اور پھر نکالنے کے سامان بھی آپ ہی کی طرف سے ہیں اگر پانی نہ دیا جائے تو زمین اصل بیج کو بھی سوخت کر دیتی ہے چہ جائیکہ اُسے باقی رکھکر بڑہائے۔ پس پانی دینا درحقیقت بیج کو باقی رکھنا بڑہانا اور بڑہا کر اُس میں سے دوسرا دانہ کھینچ لینا ہے گویا پانی اُس دانہ کو بڑا بنا کر کھینچ لینے کا ایک آلہ ہے اس لئے زمین نے نہ محض از خود بیج کو بڑہایا نہ دیا بلکہ پانی کا نشتر بھیجکر آپ نے جبراً اُس سے راس المال مع سود کے منگوالیا۔ اس لئے زمین کا ذاتی خاصہ قبض و بخل بحالہ ثابت شدہ رہا۔

اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادّہ انسان کا جزو اعظم ہے اور وہ مشت خاکی کہلایا تو جبلّی طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے چنانچہ پیدا شدہ بچّہ کو ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لئے کھنچتا ہے نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے آپ جو چیز بھی بچّہ کے سامنے ڈالدیں گے اُسے اُٹھائیگا اور طبعی تقاضا سے مُنھ کی طرف لیجائیگا تاکہ اُسے قبض

کر کے ہضم کر جائے اُسے دیتے رہو تو خوش رہے گا چھیننے لگو تو چلّائے گا بس جبلّی طور پر اُس کی طبیعت سخا و ایثار کی طرف نہیں جاتی بلکہ قبض و بخل کی طرف کیونکہ اس کے عنصر خاکی کا غالب خلق ہی قبض و بخل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قبض و بخل جس کا منشا حرص و طمع ہے محتاجگی اور غلامی پیدا کرتی ہیں غنا و استغناء سے انہیں کوئی واسطہ نہیں کیونکہ بخیل اوّل تو خود اُس شے کا محتاج ہوا جس میں بخل ظاہر ہوا پھر اُس شخص کا محتاج ہوا جس کی شے ہے پھر اُس کی عطاء کا محتاج جس کی بدولت یہ شے اُس کے پاس آئیگی پس اگر معطی اور عطاء اور عطیہ نہ ہو تو یہ بخیل اس درجہ محتاج ہے کہ اپنے بخل کا بھی پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا اس لئے ایک بخیل کسی چیز کے لینے سے پیشتر تو معطی کا محتاج ہے اور لینے کے بعد اس عطیہ کا محتاج ہو جاتا ہے کہ اپنے قلب و قالب کو اُس سے جدا کر لینے پر قدرت نہیں رکھتا اسلئے بخیل کے اوّل و آخر محتاجگی اور غلامی ہی غلامی نکلتی ہے اور زمین میں چونکہ یہی وصف ایک امتیازی وصف ہے اس لئے اُس کی محتاجگی و ذلتہ بھی سارے ہی عناصر سے زائد ہے اس لئے یہ خاکی انسان خاکی رہتے ہوئے جبلّی طور پر بخل کے رذیلہ میں گرفتار رہتا ہے جو سراپا احتیاج و ذلتہ ہے۔

اگر وہ قبض و بخل کے بجائے سخا و ایثار پیشہ بنجائے تو اُس کا ثمرہ استغناء ہے جو سراپا عزت و محبوبیتہ ہے اور اُس میں کسی غیر کی احتیاج و غلامی نہیں بلکہ غیر ہی سے اپنی غلامی کراتا ہے۔

آگ اور اُس کے جبلّی اخلاق

اسی طرح آگ کو لو تو اس کی طبعی خاصیت اور جبلّتہ ترفّع ہے کہ سر نیچا ہی نہیں کرتی کسی واجبی مصلحت سے بھی دباؤ تو نہیں دبتی گویا آگ خاک کی ضد ہے کہ

وہ ہمہ تن پستی ہے اور یہ سرتاپا تعلّی۔ ناری شیطان نے یہی کہکر آدم کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا تھا کہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین۔ ظاہر ہے کہ انسان میں آگ کا بھی ایک کافی حصّہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اُس کی بدنی حرارت اور بعض اوقات بخار کا ہیجان اس کی کافی دلیل ہے اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں بھی جبلّی طور پر وہی ترفّع اور تعلّی شیخی اور انانیتہ کا جذبہ اُبھرتا ہے جو حقیقت میں ناری اثر ہی چنانچہ تعلّی اور شیخی سے مغلوب ہوکر جب انسان میں جوش غضب اور غصّہ کی لہر دوڑ جاتی ہے اُس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ پر آگ کی سی سرخی آجاتی ہے تو عُرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص آگ بگولا ہوگیا یا فلاں میں غصّہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میں غصّہ کا پانی بہنے لگا یا غصّہ کی مٹّی بکھرنے لگی۔ بلکہ مٹّی ہوجانا اُس کے ٹھنڈے ہوجانے کی علامت شمار ہوتی ہے کہ مٹّی درحقیقت آگ کی ضد ہے۔ بہرحال انسان کا یہ ترفّع و تعلّی اور انانیتہ درحقیقت وہی ناری خلق ہی اب اس خلق پر غور کرو تو یہ بھی سراپا احتیاج و ذلّتہ نظر آئے گا۔ کیونکہ تعلّی و ترفّع کا حاصل دوسروں پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو اُن کی نظروں میں بڑا دکھانے یا اُنکے خیال میں بڑا سمجھوانے کی کوشش کرنا ہے پس اس ترفّع کا مدار درحقیقت دوسروں پر اور وہ بھی دوسروں کے خیال پر نکلا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں یا اُن کا خیال اُس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اُسکی بڑائی کی عمارت ہی منہدم ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہوگی کہ عزّت ہماری ہو اور قابو میں دوسرے کے ہو رفعت ہماری ہو اور دوسرے کے خیالات کی بہنے والی رو میں بہتی ہوئی جارہی ہو کہ دوسرے کے پاس بھی اُسے تمکّن اور استقرار نصیب نہیں اسی بناء پر تعلّی و تفاخر کے لئے مداراۃ ناس اور تملّق بھی لازمی ہے تاکہ اُن کا خیال بدلنے نہ پائے اور یہ ترفّع کا بھوکا اُن کی نظروں میں سبک

نہ ہونے پائے۔ پس جو خُلق ایک انسان کو ہزارہا انسانوں کا محتاج بناتا ہو اُس سے زیادہ ذلت آمیز اور احتیاج خیز خُلق اور کونسا ہوگا ہاں اس کے بالمقابل تواضع کا خُلق ہے جس کی حقیقت بلا مجبوری و پابندی محض اپنے قصد و ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں وہ سمجھیں مگر ہم تو اپنی ہی اصلیت پر ہیں جو آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کسی حال بھی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ پس تواضع کا حاصل استغنا اور ترفّع کا حاصل محتاجگی اور غلامی نکل آیا نیز تواضع کے سلسلہ میں بلند اور رفیع ہوتے ہوئے قصد و ارادہ سے جھکنا اعتماد علی النفس کی دلیل ہے کہ اُس پر خود کو قابو ہے کہ وہ تو اپنی ناریت سے مرتفع ہونا چاہتا تھا اور ہم اُسے اس خاکیت سے جھکا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نفس پر قدرت اور قابو مالکیت کی دلیل ہے۔ جو محتاجگی کے منافی ہے کیونکہ محتاجگی ہمیشہ مملوکیت میں ہوتی ہے نہ کہ مالکیت میں ادھر شیخی میں انسان کو اپنے اوپر قدرت نہیں رہتی جو مجبوری اور محتاجگی ہے پس تواضع سے استغنا اور ترفّع و نخوت سے احتیاج و غلامی پیدا ہونا اس جہتہ سے بھی واضح ہے۔ غرض جبتک انسان اس ناریت کے جال سے رہا نہ ہو یہ ناری خلق اُسے محتاج اور ذلیل ہی بنائے رکھتا ہے کہ احتیاج کی خاصیتہ ہی ذلتہ و مسکنتہ ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ آگ بھی اپنی جبلتہ سے محتاجگی کا ثمرہ پیدا کرتی ہے نہ کہ غنا کا۔

ہوا اور اُس کے جبلّی اخلاق

اسی طرح ہوا کو لیجئے کہ اُس میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود رہے ہر جگہ گھسی رہے ہر جگہ بھری رہے ذرہ ذرہ اُس سے وابستہ رہے گویا اُسے پہچانتا رہے انسان میں ہوائی جزو بھی ہے جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے

نمایاں ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ میں ہر جگہ موجود رہوں ہر جگہ گھسا رہوں ہر زمان اور ہر مکان میں میرا وجود رہے مگر چونکہ خود اُس کا مادّی نفس اتنا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ رہے اس لئے وہ انتشارِ صیت۔ شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچا کریں میرا ذکر پھیلائیں اور اپنے ذکر و تذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہوں۔ پس ہوائے شہرت انسان میں۔ اسی ہوائی جزو کا اثر ہے غور کرو تو اس شہرت پسندی کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے کیونکہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اُسے پہچانیں اور اُس کے بعد اُس کی ہوا بندی بھی کریں اُس کا پروپیگنڈا اور چرچا بھی کریں اور اُسے اڑاتے بھی رہیں پس اس خلق کا حاصل بھی وہی غیروں کی احتیاج نکل آئی اس لئے شہرت پسندی بھی کوئی عزت آفریں خلق نہیں بلکہ ایک ذلت افزا ملکہ ہے جو اپنی مقاصد کو دوسروں پر معلق کر دیتا ہے بخلاف شہرت پسندی کی ضد کے جیسے اخفا و تستّر کہتے ہیں کہ اُس کی حقیقت از خود بخود مگن رہنا اور دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہو جانا ہے ذرا خیال کہ اس غنا پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اُس مصنوعی اور جعلی شہرت سے بدرجہا پائیدار ہوتا ہے بہر حال ہوا کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی اور جگہ جگہ مارے مارے پھرنا نکل آیا۔

پانی اور اُس کے جبلّی اخلاق

اسی طرح پانی کو لو تو اُس کا طبعی فعل ہے عدم الکف اور عدم الضبط یعنی پانی میں اعتماد علی النفس کا نشان نہیں وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا ہر طرف سے آپ روک لگائیں رُک جائیگا اور جہاں بند ٹوٹا یا برتن پھوٹا وہیں پانی بکھر اسیدھا چل رہا ہے! اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہہ گیا ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی اور

وہ اپنا مستقر چھوڑ کر وہیں آرہا۔ انسان میں بھی چونکہ پانی کا جزو موجود ہے جیسا کہ تھوک سنک بلغم پیشاب وغیرہ سے واضح ہے اس لئے اُس میں بھی ضبط نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے کسی کی عورت نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے کوئی قبول صورت چیز نظر پڑ گئی تو وہیں اُس کے پیچھے پیچھے ہو لئے کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچائی نظروں سے اُسے دیکھنے لگے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی غرض ذرا سا نشیب سامنے آنے سے بکھر پڑنے کا مادّہ انسان میں آبی جزو سے آیا ہے مگر اس کا حاصل بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے کیونکہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا عدم قدرت اور عجز کی دلیل ہے اور عجز جڑ ہے محتاجگی کی ہاں ضبط نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اُس سے بے نیاز رہنا خود کو قابو میں رکھنا اور گرنے سے بچا لیجا نا قدرت کی دلیل ہے جس کا حاصل وہی استغنا نکلتا ہے۔ اس لئے پانی کی طبعی خاصیت بھی وہی احتیاج اور غلامی نکل آئی۔

رذائل نفس کے چار اُصول

پس اس طرح ان مادّی اخلاق یا رذائل نفس کے چار اُصول نکل آتے ہیں قبض و بخل تعلّی[۲] و ترفّع شہرت[۳] پسندی وانتشار صیت عدم[۴] ضبط نفس یعنی حرص و ہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج و غلامی بنا دیتے ہیں۔

فضائل نفس کے چار اُصول

ہاں پھر یہیں سے استغناء و خودداری کے اُصول پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ ان اخلاق چارگانہ کی ضد ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قبض و بخل کی ضد سخا و ایثار ہے کبر و نخوت کی ضد تواضع و فروتنی ہے شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء و تستّر ہے حرص و ہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبط نفس اور قناعت ہے اور جبکہ یہ چارگانہ اضداد مادّہ کے

چارگانہ اخلاق کی ضدیں ہیں تو یقیناً انہیں مادّی اخلاق بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ انہیں رُوح کے رُوحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے جو مادّہ کی ضد ہے! ور اس طرح اگر مادّہ کے جوہر میں سے رذائل نفس کے چار اُصول نکلے تھے تو رُوح کے جوہر میں سے فضائل نفس کے بھی چار ہی اُصول نکل آئے۔ ایثار۔ تواضع۔ افتقار۔ قناعت۔

اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں

لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق کے جبلی آثار افعال ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں اگر اُن اخلاق کے مناسب افعال سرزد نہ ہوں تو اخلاق کے طبعی آثار ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتے۔ جیسے مثلاً خلق شجاعت کی تاثیرات بغیر فعل مقاتلہ و مقابلہ کے کبھی نہیں کھل سکتیں۔ خلق سخاوۃ کی تاثیرات بغیر فعل داد و دہش کے کبھی نمایاں نہیں ہو سکتیں خلق تواضع کی کیفیات بغیر انکساری کے جھکاؤ کے سامنے نہیں آ سکتیں یہی حال اور تمام اخلاق کا بھی ہے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ ان مادّی اخلاق کے اثراتِ محتاجگی اور روحانی اخلاق کے آثارِ استغنار و خودداری بھی بغیر اپنے اپنے مناسب افعال کے ظہور پذیر نہوں۔ اس لئے سوال یہ ہوتا ہے کہ مادّی اور روحانی اخلاق کے آثار کو ظاہر کرنے والے افعال کون سے ہیں؟

مادّی اخلاق کا مظہر فعل امساک ہے

سو مادّی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا گیا اُن کا حاصل بجز خود غرضی اور خود مطلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا بخل ہو یا حرص شہرت پسندی ہو یا تعلّی سبکی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامن ہوس میں سمٹ آئے۔ گویا ہر چیز کا اوروں سے روک کر اپنے لئے مختص کر لینا ان

نفسانی اخلاق کا مقتضیٰ ہے۔ چنانچہ قبض اور بخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے رُکی
جاتی ہے۔ حرص و ہوس میں دوسروں کی مقبوضہ چیز اُن سے روک کر اپنے لئے
چاہی جاتی ہے۔ تعلّی و ترفّع میں ہر درجۂ کمال کو دوسروں سے منفی کرکے اپنے سے
مختص ظاہر کیا جاتا ہے۔ شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر
صرف اپنا نام چاہا جاتا ہے پس اُن سب اخلاق میں کسی نہ کسی جہت سے اوروں
سے رُکاوٹ اور اپنا اختصاص کارفرما رہتا ہے اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان
اخلاق کے طبعی آثار کو جو فعل بطور قدرِ مشترک کے کھولتا ہے وہ امساک ہے
بخل و حرص میں یہ امساک مالی ہوتا ہے اور تعلّی و نام آوری میں امساک
جاہی مگر حبِ جاہ ہو یا حُبِ مال دونوں کا مظاہرہ اس فعلِ امساک ہی سے
ہوتا ہے گویا ان اخلاق کے طبعی آثار خود غرضی و محتاجگی بغیر فعلِ امساک کے نمایاں
نہیں ہو سکتے۔

رُوحانی اخلاق کا مظہر فعلِ انفاق ہے

ادھر روحانی اخلاق چونکہ ہر حیثیت سے مادّی اخلاق کی ضد ہیں اس لئے
ان کے طبعی اثرات اور اُن اثرات کو ظاہر کرنے والے افعال بھی مذکورہ افعال
کی ضد ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جیسے مادّی اخلاق
کا اثر خود غرضی تھا رُوحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار و تواضع ہو یا احتقار
و قناعت ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی اس خود غرضانہ خواہش پر
نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اُسی کو مل جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں
کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے قناعت
میں دوسروں کی چیز انہیں کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے تواضع میں اپنی عزت دوسروں

نثار کی جاتی ہے اور اخفا رمیں دوسروں کی عزت کے لئے پورا میدان دیدیا جاتا ہے غرض ان تمام اخلاق کی بنیاد دوسروں سے روکنے یا چھیننے پر نہیں بلکہ دوسروں کو دینے اور عطا و نوال پر ہے اس لئے واضح ہوتا ہے کہ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھولتا ہے وہ فعل امساک نہیں بلکہ اس کی ضد انفاق ہو سکتا ہے سخاوت و قناعت میں یہ اتفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع و اخفا رمیں انفاق جاہی مگر استغناء مالی ہو یا استغناء جاہی بغیر فعلِ انفاق کے کمل نہیں سکتا اور یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جاہ و مال سے یہ بے نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنا دیتی ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مستحکم کر دیتی ہے جس سے وسعتِ صدر اور فراخدلی کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے اس لئے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعتِ حوصلہ استغناء وقار خودداری بے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے۔ شریعت کی اصلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان و مال آبرو اور قول و عمل کو مالک الملک کے لئے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں۔ پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوبات نفس اور لذائذ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بالطبع شاق ہے۔ اس لئے اسی کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ طبعی امساک کے ذریعہ انسان میں جو محتاجگی اور تنگی قائم ہوتی ہے اس کے مٹانے اور اس کی جگہ استغناء و خودداری کی دولت جاگزین کرنے کا ذریعہ صرف صدقہ و مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے گویا انفاق کا جو درجہ بھی امساک کے مقابلہ پر آتا رہیگا اسی درجہ نفس انسانی میں محتاجگی و غلامی مٹ کر استغناء کے مراتب قائم ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ صدقہ سے وہ مادی اخلاق مضمحل اور کمزور پڑتے جائیں گے جن کی بدولت امساک کے افعال نمایاں ہوتے تھے۔

صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہوتا ہے

چنانچہ ایک صدقہ دینے والا جب اپنے محبوب مال و متاع کو اپنے سے کھو دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُس نے قبض و بخل کی تو جڑ کاٹ دی جو ارضی خلق تھا ورنہ غلبۂ بخل کے ہوتے ہوئے یہ متاع جدا ہی کب کی جا سکتی تھی اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی قبض و بخل کا رذیلہ سست پڑے گا جو محتاجگی کی جڑ تھا اُسی حد تک سخا و ایثار کا ملکہ راسخ ہو گا جو ذریعۂ استغنار ہے اور اس طرح استغنار کے ایک بڑے درجہ پر فتح حاصل ہو جائے گی۔

پھر جب کہ اک صدقہ دہندہ کو عطا و نوال میں لطف محسوس ہونے لگا تو ظاہر ہے کہ اب وہ دوسروں کی چیزوں پر نہ نگاہ حرص ڈال سکے گا نہ کسی کی چیز دیکھ کر بھر سکے گا بلکہ اُس کے عطا و تصدق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو تھامے رکھنے کا خواہشمند ہے جسے قناعت کہتے ہیں پس اسی صدقہ و انفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہو گیا جو آبی خلق تھا اور اس طرح استغنار کا ایک دوسرا مقام اور طے ہو گیا۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہونچکر اپنی چیز کی محبت قطع ہوئی تھی جس سے بخل قائم تھا اور دوسرے مقام پر پہونچکر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی جس سے حرص قائم تھی۔ اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا۔ پھر جبکہ یہ صدقہ اخفار کے ساتھ کیا گیا جس میں نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں ہو سکتی ورنہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ تو اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی جڑ کٹ گئی جو ہوائی خلق تھا اس عظیم محتاجگی کی جڑ کٹ جانے سے جس کی تفصیلات آ چکی ہیں استغنار کا ایک اور مقام تیسرا آ گیا۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ صدقہ دہندہ اپنے اس عمل کو چھپانے کی سعی جب ہی کرسکتا ہے جب کہ اُسے اپنا یہ عمل دوسروں کے عمل سے کم نظر آئے اور وہ اپنے عمل کی دوسروں کے عمل کے مقابلہ میں کوئی برتری اور بڑائی اپنی نگاہوں میں محسوس نہ کرے ورنہ وہ اس عمل کو مخفی رکھنے کے بجائے دوسروں کے عمل سے برتر اور فائق تر ظاہر کرنا اور جابجا اُس کا چرچا کرنا پسند کرتا لیکن جب کہ وہ اپنے صدقہ کو دوسروں کے صدقات سے نسبتہ تک دینے سے رک رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے عمل کے تفوّق و برتری کے خیال سے بھی جدا ہو چکا ہے اور اس طرح دوسروں کی نسبتہ خود اپنی ذات کی برتری اور تعلّی سے بھی بیزار رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اخفاء صدقہ سے تعلّی و ترفع کی جڑ بھی کٹ گئی جو آتشی خلق تھا۔ اور اس طرح استغناء کا ایک چوتھا مقام میسّر آگیا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی نیکی کے اخفاء میں مبالغہ اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا گویا خود اپنے نفس کو بھی خبر نہ ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نیکی پر خود اپنے ضمیر میں بھی اُسے کوئی فخر و ناز محسوس نہ ہو وہی کرسکتا ہے جس کے دل میں اُس نیکی کی بمقابلۂ غیر ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت اپنے فعل ہونے کے بھی ذرہ برابر وقعت و عظمت نہ ہو اور اس طرح گویا خود اپنی عظمت و بڑائی کا نفس میں کوئی تخیّل نہ ہو بلکہ وہ اسے محض ادائے فرض کہہ کر کرے نہ کہ ادائے حق جانکر ظاہر ہے کہ صدقہ کے اس اخفاء تام سے خود پسندی اور عُجب کی جڑ کٹ جاتی ہے جس سے استغناء کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسّر آجاتا ہے۔

استغناء کے یہ آخری تین مقامات جاہ کے سلسلہ میں محتاجگی سے آزادی دلاتے ہیں جیسا کہ اوّل کے دو مقامات مال کے سلسلہ میں محتاجگی سے بچاتے تھے ان تین مقامات میں باہمی فرق و تفاوت۔ ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہونچکر صدقہ دہندہ دوسروں سے طالب جاہ نہیں رہتا دوسرے مقام پر اپنے عمل سے کاسب جاہ

نہیں رہتا اور تیسرے مقام پر خود اپنے نفس سے بھی تحمّل جاہ قائم کرنے کا روادار نہیں رہتا اور اس طرح ان پانچوں مقامات کے ذریعہ مال وجاہ دونوں کے سلسلہ میں اس محتاجگی اور پابستگی سے آزاد ہو کر جس نے اُسے ذلّت و پستی کے حضیض میں گرا رکھا تھا۔ غیر سے بھی غنی ہو جاتا ہے اور خود اپنے سے بھی مستغنی۔

مادّیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے

الحاصل اس مادہ پرست اور مادّی نفس کے دو رذیلے بخل اور حرص تو نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے تھے اور تین رذیلے تعلّی۔ نام آوری اور خود بینی اخفاء صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا سخی ہو گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ اُسے اپنی دولت کی کوئی پرواہ نہ رہی حریص نہ رہا بلکہ قانع بن گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ اُسے غیروں کی دولت کی بھی پرواہ نہ رہی شہرت پسند نہ رہا بلکہ عزلت پسند ہو گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ اُسے لوگوں کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہ رہی شیخی پسند اور خود بیں نہ رہا بلکہ خود گذار ہو گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ اُسے اپنے نفس کی بھی پرواہ نہ رہی تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے عالم میں کسی کا غلام نہ رہا اور اُسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسّر آ گئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہو کر اب اگر اس کا رشتۂ نیاز کسی سے جُڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی خاطر اس نے یہ اپنا مال اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ تخلق کیا۔ اندریں حالت اُسے مناسبتہ پیدا ہوئی تو اُس غنی عن العلمین سے اور لگاؤ پیدا ہوا تو صرف اُسی ذات بے نیاز سے جو اپنے کاموں میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ ہر چیز اپنے وجود وظہور میں اُسی کی دست نگر ہے۔

تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے

اور اس صورت میں ضروری ہے کہ اس مرد متصدق اور بندہ مجاہد یا تارک ماسویٰ میں بھی جس نے اُس غنی مطلق سے نسبت قائم کرلی ہے غناء کامل کا ظہور ہو۔ اور وہ بھی اپنے کسی کام میں ان مخلوقاتی وسائل یعنی مادی ذرائع کا محتاج نہ رہے بلکہ خود یہ وسائل ہی اُس کی چشم و ابرو کو دیکھنے لگیں۔ اُس کے تصرفات بلا وسائل زمین تک ہی نہیں آسمانوں تک بھی پہونچنے لگیں۔ وہ اوپر جائے تو طیاروں کا محتاج نہ ہو۔ اور زمینی مسافت طے کرے تو ریلوں اور موٹروں کا پابند نہ ہو وہ عالم میں اپنی صدا پہونچائے تو ہوا و برق کا دست نگر نہ ہو اور عالم کی صدائیں سننا چاہے تو ریڈیو اور ٹیلیفون کا محتاج نہ ہو۔ غرض اُس کے ہاتھوں پر وہ کچھ ظاہر ہو جسے دنیا کے سارے فلسفی اور سائنسداں ملکر بھی ظاہر نہ کرسکیں۔ ورنہ کم سے کم غناء کا یہ درجہ تو اُسے ضرور حاصل ہو جائے کہ علم و اعتقاد کے درجہ میں تو وہ ان وسائل کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اُسے ان اسباب و وسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے۔ بلکہ عادۃً کے طور پر محض حیلہ کے درجہ میں اور وہ بھی امر خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا رہے۔ پس پہلا درجہ توکل و غناء کا اعلیٰ مقام ہے جس میں ترک اسباب پر پوری قدرت محسوس ہونے لگے اور دوسرا درجہ ثانوی ہے جس میں گو یہ قدرت نہ ہو مگر معرفت صحیح ہو جائے اور اختیار اسباب میں غلو اور انہماک باقی نہ رہے۔

بہرحال اب پوری طرح کھل گیا کہ مادّہ میں بجز محتاجگی اور ذلت نفس پیدا کردینے کے کوئی جوہر نہیں کہ اُس کے اخلاق کی خاصیت ہی احتیاج و غلامی ہے جس کا ظہور فعل امساک سے ہوتا ہے۔ اور رُوح میں بجز عزت نفس پیدا کرنے کے دوسرا

کوئی جذبہ موجود نہیں کہ اُس کے فطری اخلاق کی طبیعت ہی استغنار وغنا ہے جو منشار عزت وعظمت ہے جس کا ظہور فعل انفاق سے ہوتا ہے جسے صدقہ کہتے ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مادّی اور روحانی اخلاق اُن کی نوعیتوں اور اُن کے خواص وآثار میں تضاد کی نسبت ہے کہ خود رُوح ومادّہ ہی میں تضاد کی نسبت ہے رُوح ایک لطیفہ ربّانی ہے اور جسم ایک کثیفہ ظلمانی۔ وہ مائل بہ عُلو ہے یہ مائل بہ سفل وہ انسان کو عرشی بناتی ہے یہ فرشی وہ اُسے سربلند کرتی ہے یہ سرنگوں۔ گویا ان دونوں کی مثال ترازو کے دو پلّوں کی سی ہے کہ جتنا ایک کو جھکا دیا جائے دوسرا اُسی قدر اُٹھ جائے گا۔ اس لئے آپ ان مادّی تصرفات کے ذریعہ مادّی اخلاق کو جس قدر بھی قوۃ اور رُسوخ دیں گے روحانی اخلاق اُسی قدر مضمحل ہوتے رہیں گے۔ اور اُسی حد تک استغنار نفس مٹ کر احتیاج وذلتہ نفس کی زنجیریں مضبوط ہوتی رہیں گی جس کو دوسری تعبیر سے یوں سمجھ لیجئے کہ رُوح جیسا فاضل بادشاہ جس حد تک جسم جیسے کمینہ اور بے شعور غلام کے زیر اثر بسر کرتا رہے گا اسی حد تک اپنی ساری فرمانروائی کی عزت وشوکت برباد کرتا رہیگا اور نتیجۃً انجام کی تباہی وبربادی دونوں ہی کو گھیرتی رہے گی۔ لیکن اگر صدقہ ومجاہدہ یعنی مادّیات اور مادّی لذّات سے بے نیازی کے ذریعہ ان روحانی اخلاق کو قوۃ ورسوخ کا موقعہ دیتے رہیں گے تو احتیاج وغلامی مٹ کر اُسی حد تک استغنار وکمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی جس سے کائنات بدن میں رُوح کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور بدن کا غلام ہر آن اُس کے سامنے دست بستہ حاضر رہکر محض بجا آوریٔ احکام کے لئے رہ جائے گا جس سے دونوں اپنے اپنے منصبی کاموں میں بھی لگے رہیں گے دونوں کی عزت بھی بقدر مرتبہ قائم ہوگی۔ اور اقلیم جان کا عدل بھی استوار رہے گا۔

سائنس محض کبھی یہ غنا پیدا نہیں کر سکتی

اور جبکہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادّی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلۃ نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہ ہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ ومجاہدہ جن سے استغنا ر وعزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس توانجام کار انسان کو ذلۃ نفس اور ہلاکت کی طرف لیجاتی ہے اور اسلام انجام کار اُسے عزت وفلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔ پہلی صورت یعنی مادّیات کا غلو اور سائنس کا بُحران رُوح کی پامالی اور مادّہ کے غلبہ کی ہے جس سے عزیز تو ذلیل اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے جو قلب موضوع اور دونو کے لئے موجب ہلاکت ہے اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف رُوح کی سربلندی اور مادّہ کی محکومی کی ہے جس سے عزیز مسند عزت پر اور ذلیل اپنی حدّ ذلۃ ومقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین میں موجب فلاح وبہبود ہے۔ بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ جو اپنی بساط علم کی قدر میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے۔ اور یہی اس تقریر کے تین مقاصد میں سے پہلا مقصد تھا۔ جو الحمدللہ کہ اتمام کو پہونچ گیا۔

سائنس اور اسلام میں وسیلہ ومقصود کی نسبت ہے

اب اس پر غور کیجئے کہ یہ چونکہ مادّہ اور اس سے تیار شدہ بدن محض ایک ڈھانچہ ہے جس کی زندگی رُوح سے ہے اور رُوح اُسے زندہ رکھ کر اپنے علوم وکمالات کو اُسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے۔ پس بدن کمالات رُوح کے ظہور کا ایک

ذریعہ اور آلہ ہے چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اُس مقام معلوم
تک پہونچ جاتی ہے جو ازل سے اُس کے لئے طے شدہ تھا جب ہی اس ڈھانچہ
اور وسیلہ کو روح سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً فاعل نہیں بلکہ محض
قابل ہے اور اصل نہیں بلکہ محض وسیلہ ہے۔ اگر اس جسم کو بالاستقلال مقصودیت کا
درجہ دیدیا جائے تو یہ فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنا لینا ہے جس کا انجام سڑنے
گلنے اور دماغوں کو پراگندہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب کہ سائنس کا موضوع
محض یہ جسمانیات اور مادی چیزیں ہی ہیں اور مادیات ڈھانچہ اور وسیلہ ہے
زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں تو خود بخود حل ہو گیا۔ کہ سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولی
وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے۔ اور جبکہ اسلام کا موضوع بالاصالت
روحانیات اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے تو یہ بھی خود ہی واضح
ہو گیا کہ اسلام کے تمام امور بھی مقصودیت کے درجہ سے کسی طرح نہیں گر سکتے
ان دونوں صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح
کے لئے وسیلۂ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے
لئے ایک وسیلہ و ذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہو گی جس کی زندگی اور روح اسلامی
اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں
نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اُس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی جس کا انجام
بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر صحیح دماغوں اور صحیح قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف
فضا کو خراب کر دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایسی ہی سائنس جس کا حاصل تعیش محض اور عناصر اربعہ کے خزانوں
کو بلا دینی روح کے استعمال میں لاتا ہے اور جسے اصطلاح میں دنیوی زندگی
پکارا جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں لاشہ بے جان اور چند دن اپنی سطحی چمک دمک

اور زینت دکھلا کر خاک کا ڈھیر ہو جانے والا ایک لاشہ ہے جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں ارشاد حق ہے۔

اعلموا انما الحیٰوۃ الدنیا	تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب اور
لعب و لھو و زینۃ وتفاخر	زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال
بینکم و تکاثر فی الاموال	واولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ
والاولاد کمثل غیث اعجب	بتلانا ہے۔ جیسے مینہ ہو کہ اس کی پیداوار کاشتکار کو
الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ	اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے۔ سو تو
مصفرا ثم یکون حطاما۔	اسکو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔

اسی غیر ضروری تعیش یا تعیشِ محض اور جمع وسائل کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف بتلایا گیا ہے ارشاد نبوی ہے۔

الدنیا دار من لا دار لہ ولھا	دنیا نگھرے کا گھر ہے اور اس کی جمع پروہی
یجمع من لا عقل لہ	پڑے گا جس میں عقل کا نشان نہ ہو۔

بہر حال حسی عقلی اور نقلی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح جسم اور مادہ روح کے لئے وسیلۂ عمل ہے خود مقصود اصلی نہیں اسی طرح مادی تصرفات جن کا نام سائنس ہے روحانی تصرفات کے لئے جن کا نام اسلام ہے اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں خود مقصودیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود کی ضرورت سے اختیار کیا جاتا ہے اور اُسی حد تک اختیار کیا جاتا ہے جس حد تک مقصود میں معین ہو یعنی بقدر ضرورت ورنہ بالاصالۃ اُس میں انہماک رکھنا اُس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا ہے جو قلب موضوع اور خلاف عقل ہے اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رکھ

سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل قرار نہیں پا سکتا بلکہ اُسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدارِ ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی اسی لئے اس دنیا سے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبانِ نبوی پر دی گئی ہے جس حد تک مذہبی مقاصد میں اُن کی ضرورت ہو۔ ارشادِ نبوی ہے:-

اعمل للدنیا بمقدار بقائك فيها — دنیا کے لئے اُتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے

واعمل للآخرة بمقدار بقائك فيها — اور آخرت کیلئے اُتنا کرو جتنا وہاں رہنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کا درجہ وسیلہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا کہ اُس کا معمول اصلی مادّہ ہے اور مادّہ رُوح کے لئے محض وسیلہ ہے اور اسلام کا درجہ مقصودیت سے گر نہیں سکتا کہ اُس کا معمول اصلی رُوح ہے اور رُوح مادہ کے لئے اصل مقصود ہے۔

اس تقریر سے الحمد للّٰہ پوری طرح "سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت" بھی واضح ہوگئی اور کھل گیا کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے جو موضوعِ تقریر کا دوسرا مقصد تھا۔ اور جس کا حاصل یہ ہے کہ سائنس کے کارنامے جب تک مذہب کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہوں گے خواہ وہ ترقی کی کسی حد پر ہی پہونچ جائیں اُن کا انجام خوشگن ہوگا۔ اور جب اُس سے جدا ہو کر خود مقصودیت کی شان لے لیں گے یعنی روحانیت ترک ہو کر مادّیت محضہ مقصود کی جگہ لے لیگی خواہ وہ کم سے کم بھی ہو جب ہی انجام خطرناک اور ذلّت آمیز نکلے گا۔

(۳)

سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا ہم پر تقاضا کیا ہے

اسی سے آپ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ آپ کی ترقی کا میدان کیا ہونا چاہیئے؟ جس کے شور سے آج فضاء، دنیا گونج رہی ہے اس کا فیصلہ بھی وہی عقلِ سلیم کر سکتی ہے

جس نے اُن میں سے ایک کو وسیلہ اور ایک کو مقصود باور کرایا ہے کہ آیا ترقی وسائل میں کی جاتی ہے یا مقاصد میں؟ اور ترقی کی دوڑ راستہ کے لئے ہوتی ہے یا منزل مقصود کے لئے؟ پس اگر سائنس وسیلہ ہے اور بشہادۃ عقل ونقل ضرور ہے جیسا کہ ثابت ہوگیا تو پھر عقل ہی کی شہادۃ سے وہ مطلقاً کبھی میدان ترقی بھی قرار نہیں پاسکتی کہ وہ تو راہ محض ہے منزل مقصود نہیں اور اگر اسلام مقصود اصلی ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقل ونقل سے ثابت ہو چکا ہے تو اسی کو دوڑنے اور ترقی کرنے کا میدان بھی بنایا جا سکتا ہے کہ وہ راہ محض نہیں شہر مطلوب ہے جس میں پہونچنے کے لئے ساری جد وجہد تھی چنانچہ قرآن کریم نے ترقی کو روکا نہیں بلکہ انسان کو دنیا میں بھیجا ہی ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہاں وسائل میں ترقی کرنے کو اضاعۃ وقت کہا ہے اور مقاصد میں جن کا عنوان خیرات ومبرات رکھا ہے ترقی کرنا نہ صرف روا ہی بتلایا ہے بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ربانی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ہر قوم کے لئے ایک قبلہ مقصود ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتی ہے سو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں سبقت کرو۔

دوسری جگہ نعیم آخرت کا ذکر فرما کر جو تمام خیرات ومبرات کا مقصود اصلی ہے ارشاد فرمایا۔

وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنا چاہئے

پس ایک جگہ سبقت باہمی اور ایک جگہ حرص باہمی کے عنوان سے مسلمانوں کو ترقی کے لئے ابھارا گیا اور مامور کیا گیا ہے لیکن یہ ترقی اسی میدان کی ہے جس کی فطرتاً ہونی چاہیئے یعنی مقاصد کی کیونکہ وسائل میں ترقی ترقی نہیں بلکہ بے عقلی ہے اس اصولی حقیقت کے پیش نظر اب آپ اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ نے کس طرح اس موضوع کو الٹ دیا ہے مقصود کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود بادشاہ کو غلام اور

غلام کو بادشاہ بنا دیا ہے اسلام کو تابع محض اور رسمی واسمی کرڈالا ہے! ورسائنس کو مقصود حقیقی اور مطلوب اصلی قرار دے لیا ہے پھر ساتھ ہی اس کے انجام بد کو بھی پیش نظر رکھئے کہ ان حالات میں یہ مادہ کا کمینہ غلام آپ کو حرمان وخسران کے کس گڈھے میں لیجا کر گرائے گا۔ جیسا کہ اب تک اقوام کو گراتا آیا ہے۔ اللہ کے نذیر مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خالص نمائشی کروفر اور مادیات کی اسی چمک دمک پر جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں زینۃ اور زہرۃ ہے خوف کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے

واللہ ما اخشی علیکم الفقر	خدا کی قسم مجھے اپنے بعد تم پر فقرو فاقہ پڑ جانے سے
ولکن ما اخشی علیکم من	کوئی خوف نہیں. خوف ہے تو اس کا کہ میرے بعد
بعدی زہرۃ الدنیا تفتح	تم پر دنیا کی چمک دمک کھلے گی اور تمہیں اسیطرح ہلاک
علیکم فتہلککم کما اھلکتھم	کرڈالے گی جسطرح اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک کیا ہے۔

مادیات محضہ کی مضرتیں

ہاں مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقادات بگڑتے ہیں اور پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں جس سے ہمہ عمل ختم ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں اس طرح کہ مادیات خود بے شعور ہیں چنانچہ آگ پانی ہوا مٹی میں سے کوئی ایک مادہ بھی عقل و ہوش نہیں رکھتا ورنہ انسانوں کے ہاتھ میں اس طرح بے بس ہو کر مسخر نہ ہوتا۔ اس لئے ان جہالت کے کھلونوں سے زندگی کھیلنا ظاہر ہے کہ جہل سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نیز یہ مادیات چونکہ خود محسوسات کی انواع ہیں اس لئے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور حس کا تعلق جو اس خمسہ آنکھ ناک کان وغیرہ سے ہے اسلئے ایک چشم وگوش کا بندہ مشاہدات چشم وگوش ہی میں گھرا رہتا ہے علوم قلب علوم ارواح

اور علم حقایق تک اُس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی۔ اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی نا واقف محض ہو اور نا واقفی کے ساتھ اُدھر کا رُخ بھی کرے تو اُس کا مبلغ پرواز بجز اوہام وخیالات اور شکوک وشبہات کے علوم ومعارف کب ہو سکتے ہیں ؟ اسی لئے مادّی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک وشبہات ہی گھیرے رہتے ہیں جو درحقیقت مادّیات میں انہماک وشغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیات کی طرف رجوع کر کے جو منشاء علوم وادراکات ہیں قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے جس سے اوہام ووساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوں۔

طلبائے یونیورسٹی کو خطاب موعظت

مگر مجھے معاف کیا جائے اگر میں نیازمندانہ طریق پر یہ عرض کروں کہ آج مسلمانوں میں اور آپ بُرا نہ مانیں تو آپ جیسے نئی ذہنیت کے افراد میں اُس علمی اور عرفانی روشنی کا سرے ہی سے پتہ نہیں ملتا جو شکوک وشبہات کا تریاق اور وساوس واوہام کا بدرقہ ہے۔ بلکہ قلوب میں ریب وارتیاب اور تحیّر نے جگہ پکڑ کر اصل حقیقت ہی سے بیگانہ بنا دیا ہے اور جبکہ ایمان کی وہ شفاف روشنی جو ظلمات جہل اور جہل سے پیدا شدہ شبہات کو دفع کرتی ہے۔ اور مشاہدۂ حق کی وہ تجلی ریزی جو ہر سوال کا خود ہی جواب بنتی ہے قلوب میں پیوست ہی نہیں تو محض علمی تعبیرات سے آپ قلوب کو کب تک بہلاتے رہیں گے ؟ یہ علمی عجائبات جو تقریروں کے ذریعہ آپ سننا چاہتے ہیں اُس وقت کا مشغلہ ہیں جب کہ اصل علم کا راس المال ہاتھ میں ہو یہاں ایمان ہی کی خیر نہیں نظر آتی تا بہ اسلام وعمل چہ رسد ؟

مادّیات کی مضرتیں رفع کرنے کا طریقہ

اس لئے میری صلاح تو یہ ہے اور نہ میری صلاح بلکہ اسلام کی حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ میرے عزیز بھائی اوپر کی ٹیپ ٹاپ اور مرہم پٹی کو چھوڑ کر اس مادہ فاسد کا تنقیہ کریں جو مادّی سائنس کے غیر ضروری انہماک اور غلو نے پیدا کر دیا ہے اور فلسفیت کے علم نما جہل نے اس کی آبیاری کی ہے ان حالات میں ان کا فرض ہے کہ وہ جسم کے بجائے روح کو ابھرنے کے قابل بنائیں کہ وہ ہی انسان میں علم کا منبع ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ہوائے نفسانی اور مادّی خواہشات کے بیجا مقاصد سے ذرا ایک طرف ہو کر اس منبع جود و کمال ذات حق کی طرف رجوع کریں جس سے علم و معرفت کی روشنی چلتی اور شبہات و وساوس کی دنیا کو تنگ بنا دیتی ہے

استحکام توحید

گویا دوسرے لفظوں میں نقد و مطالب یا سٹرک کو چھوڑ کر توحید پر استقامت اختیار کی جائے جو اسلام کی روح اور اصل اصول ہے اس کی تدبیر بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ کلمۂ توحید کو بار بار اور بکرات و مرات دہرایا جائے تاکہ قول کا اثر قلب پر پڑے اور توحید راسخ ہو ارشاد نبوی ہے۔

جَدِّدُوا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔

پھر اس لا الہ الا اللہ میں ایک توحید ذات ہی کا تصور نہ کریں بلکہ توحید صفات کا دھیان بھی اسی کلمہ سے کریں یعنی اللہ کے سو ناموں یا سو صفات کی توحید بھی اس کلمہ سے حاصل کریں گویا جیسے الوہیت کا اثبات و نفی اس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے ایسا ہی رحمانیت نافعیت ضاریت وغیرہ کا اثبات و نفی بھی اس طرح کیا جائے لا رحمٰن الا اللہ

لا مالک الا اللہ لا نافع الا اللہ لا ملک الا اللہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر جب قلب میں یہ ذہن نشین ہو جائیگا کہ مالک بھی ایک وہی ہے نافع بھی وہی اور ضار بھی وہی ہے عظمت وجبروت والا بھی وہی ہے اور ذوالجلال والاکرام بھی ایک وہی ہے تو اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہوگا کہ قلب سے سب عظمتیں ہٹ کر صرف ایک ذات واحد کی عظمت رہجائے گی۔ اور یہی یکسوئی اور یکرخی قلب کی قوۃ ہے۔ ایک غلام دو آقاؤں کو بیک دم خوش نہیں رکھ سکتا وہ ہمیشہ متفکر متردد اور مذبذب رہیگا جس سے قلب میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو اس یقین پر ہے کہ میرا ایک ہی آقا ہے اور وہ بھی ایسا جو علی الاطلاق ہر چیز کا مالک اور اس پر قابض ومتصرف ہے تو وہ متردد رہنے کے بجائے متیقن اور مطمئن ہو جائے گا اور یقین واطمینان ہی قوۃ قلب کی بنیاد ہے جس سے اس کی قوۃ فکری سمٹ کر ایک مرکز پر تجمع ہو جاتی ہے اور پھر اس سے عجائبات فکر اور غرائب علوم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی بصیرۃ ومعرفۃ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اسی قوۃ یقین کے ماتحت حضرات صحابہ اور سلف کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں جنہوں نے متمدن دنیا کو آج تک حیرت میں ڈال رکھا ہے ان کی ترقیات اور طوفانی کارنامے روپیہ پیسہ اور دھن دولت کے رہین منت نہ تھے بلکہ دولتیں خود ان کے کارناموں سے بنتی اور بگڑتی تھیں۔ اس لئے سب سے پہلے اپنی توحید اور توحیدی اعتقاد درست کیجئے کہ یہی ہر خیر وکمال کی بنیاد ہے۔

یادِ حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ

ہاں پھر اس توحیدی فکر کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے طمانیتہ قلب کی حاجت ہے ورنہ وساوس وخطرات اور تشویشات فکر اس صاف حقیقت پر قائم نہیں رہنے دیں گے اس لئے قرآن کریم نے طمانیتہ قلب پیدا کرنیکا مؤثر ذریعہ فرمایا کہ

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب   یاد رکھو اللہ ہی کی یاد سے دل چین پاتے ہیں۔

اس سے مقصود ذکر قلبی ہے۔ مگر ذکر قلب راسخ نہیں ہوتا جب تک کہ زبان سے اُس کا بار بار تکرار نہ کیا جائے چنانچہ طالب علم اپنے سبق کو قلب میں محفوظ کرنے کے لئے زبان ہی سے اس کو بار بار دوہراتا اور رٹتا ہے اس لئے اولاً زبان کو ذاکر بنانا چاہیئے تاکہ قلب ذاکر بن جائے۔ اور یہ ایمان و توحید دل میں اپنی جڑیں چھوڑدے اور قلب اُس پر قانع اور مطمئن ہو جائے۔

اسی لئے شریعت نے ذکر حق کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں مگر افسوس ہے کہ آج ان کا استعمال تو بجائے خود رہا اُن کا علم تک بھی مسلمانوں اور اُس طبقہ کو نہیں ہے جو تعلیمیافتہ کہلاتا ہے شریعت نے سب سے پہلے فرائض رکھے جو ذکر اللہ کا اعلیٰ مظہر ہیں اور ہر چھوٹے اور بڑے پر لازم کئے۔ اس لئے فرائض صوم و صلوٰۃ وغیرہ کی پابندی کیجئے۔ پھر اوقات مخصوصہ کی دعائیں رکھیں تاکہ چلتے پھرتے بھی خدا کی تسبیح و تحلیل آدمی کی زبان پر جاری رہے اس لئے اس قسم کے اذکار کو یاد کرنے کی فکر کیجئے۔ پھر مختلف مواقع کلام کے محاورے اسلامی زبان نے ایسے رکھے ہیں کہ اُن میں بلا ارادہ بھی ذکر اللہ زبان پر جاری رہے۔

بسم اللہ الحمد للہ جزاک اللہ انا للہ ما شاء اللہ۔ انشاء اللہ استغفر اللہ لا الہ الا اللہ وغیرہ آپ کی زبان کے رات دن کے محاورے ہیں اگر آپ استعمال کریں اور اغیار کی زبانوں سے شغف پیدا نہ کریں۔ آپکی زندگی کا کوئی ایسا کام جس سے کلام کا تعلق ہو ایسا نہیں ہے جس کے متعلقہ کلام میں اللہ کا نام داخل محاورہ نہ ہو۔ گویا اسلامی معاشرۃ میں رہکر کلام کرنے والا بے ارادہ بھی ہر وقت اللہ کا نام لینے پر مجبور ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی دینی زبان سے جس کی بدولت وہ ارادہ و بے ارادہ ہر وقت خدا کا نام لینے کی توفیق پاتے تھے نہ صرف

بے پرواہ ہی ہیں بلکہ اس کے مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ اسلام نے عربیتہ اور عربی محاورے قائم رکھنے پر اسی لئے کافی زور دیا تھا۔ کہ زبان کا اثر تہذیب کلچر تمدن اور عام احوال زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار کے آغاز کے وقت علماء وقت اور خصوصاً اکابر دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کو فہمائش کی تھی کہ وہ اپنی عربیتہ کو تھامے ہوئے غیر زبان کی ترویج و تقویتہ پر اس ذوق و شوق سے زور نہ دیں کہ وہی زبان اُن کی بنیاد اور قبلہ مقصود بن جائے مگر مسلمانوں نے ان مبصروں کا کہنا نہ مانا اور بالآخر آج وہ اُس کے نتائج بدے وہ جا رہے ہیں کہ ان کی تمدنی صورت و سیرۃ ہی مسلمانوں جیسی نہ رہی چہ جائیکہ ان کا عملی دین اصلی رنگ میں محفوظ رہتا۔

مگر بہر حال رجوع کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں اگر آپ پوری تندہی سے آج ذکر اللہ کے پابند نہیں ہو سکتے تو کم از کم عربیتہ کو زبان ہی کی حیثیت سے باقی رکھنے کی سعی کیجئے اور اُس کے دینی محاورات ہی کو زبان زد کرتے رہیے تاکہ اسی بہانہ سے خدا کا نام زبانوں پر جاری رہے نام حق کی یہ زبانی مشق اگرچہ بے ارادہ بھی ہو پھر بھی انشاء اللہ قلوب میں ایک حد تک ذکر اللہ کو قائم کرتی رہیگی

صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ

مگر ان امور کی توفیق اس کے بغیر مشکل ہے کہ اسباب توفیق بھی اُس کی ساتھ جمع کئے جائیں اور اُن میں مؤثر ترین سبب سچوں کی صحبتہ و معیتہ ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

یٰایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین۔

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیتہ اختیار کرو۔

چنانچہ صحبت یافتہ جاہل بعض اوقات غیر صحبت یافتہ عالم سے بدرجہا زائد مقاصدِ دین کو سمجھتا ہے اور دینی رنگ سے رنگین اور متصبغ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اہل علم اور اہل اللہ کے پاس آمد و رفت کو ایک مستقل مقصد کی حیثیت سے قائم رکھئے۔ برد یقین اور ثلج صدر استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اکبر نے خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

آگے حصول یقین و دین کی تدبیر کے بارہ میں کہتا ہے کہ ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس لئے میں نیاز مندانہ التماس کروں گا کہ میرے عزیز بھائی اہل اللہ اور اہل دین سے بیگانہ نہ رہیں بلکہ ان سے وابستگی پیدا کرنے کی صورتیں نکالیں۔ تاکہ انہیں دولت دین و یقین حاصل ہو اور شکوک و شبہات یا ترددات کا مادہ فاسدہ ختم ہو جائے ورنہ محض تقریروں اور وہ بھی ایسے کلی مسائل کی تقریروں سے جو خالص علمی حقائق پر مشتمل ہوں اصلاح نفوس کی راہیں استوار نہیں ہوتیں یہ اس وقت کا مشغلہ ہے جب ذوق یقین سے قلوب معمور ہو چکے ہوں۔ دین کا رنگ قوت عمل اور صحبت صلحاء ہی سے قلوب پر چڑھ سکتا ہے پس آپ حضرات کا فریضہ ہونا چاہیئے کہ مادیت کے اس ہجوم میں روحانیت کو فراموشِ محض نہ کر ڈالیں۔

خلاصہ بحث

بہر حال اس تقریر سے اسلام کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی واضح ہو گئی کہ وہ انسان کو روحانی میدان میں دوڑا کر اسے دائمی رفعت و عزت اور طمانیت

وبشاشتہ کی منزل تک پہونچا دیتا ہے کہ دائمی رفعت وعزت روحانیت ہی میں ہے۔ اور پھر ساتھ ہی سائنس کی حقیقت اور اُس کی غرض وغایت بھی سامنے آگئی کہ وہ انسان کو مادّی میدانوں میں چھوڑ کر انجام کار اُسے ذلتّ وخسران کی طرف ڈھکیل دیتی ہے کہ محض مادّیات کا انجام فنا وذلت کے سوا کچھ نہیں۔ اور آخر کار ایک سائنس زدہ نہ اپنے مادی منافع ہی کو باقی رکھ سکتا ہے اور نہ اُسے روحانی منافع ہی نصیب ہوتے ہیں۔ نیز سائنس اور اسلام کی باہمی نسبتہ بھی واضح ہوگئی کہ ان میں وسیلہ ومقصود کی نسبتہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہیں گے اُن کا انجام خوش کن نہ ہوگا۔ اور اسی کے ساتھ بطور ثمرہ یہ مقصد بھی حل ہوگیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اُس کا وسیلہ تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں یعنی سائنس کے معمولات اُسی حد تک اختیار کئے جائیں جس حد تک اسلام کو اُن کی ضرورت ہو۔

مباحث تقریر کا ربط حدیث زیب عنوان سے

یہی وہ مقاصد سہ گانہ تھے جن کی تشریح کا حدیث زیب عنوان کے دائرہ میں رہتے ہوئے میں نے ابتداء تقریر میں وعدہ کیا تھا الحمد للہ کہ ان مقاصد کی ایک حد تک توضیح وتشریح ہوچکی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد کی اس طولانی بحث کو سمیٹ کر اور حدیث عنوان پر منطبق کر کے یہ واضح کروں کہ تقریر کی یہ تمام تفصیلات جو عرض کی گئی ہیں اسی حدیث کے چند جامع اور بلیغ جملوں کی شرح ہیں اور حرف اسی کی تعبیرات سے مستنبط ہیں۔

سو بغور سنئے کہ اس حدیث کی ابتداء میں اولاً تو ملائکہ کے سوال پر عناصر اربعہ کا

تذکرہ فرمایا گیا ہے جو عالم کا مادّہ اور اُس کے موالید ثلاثہ (جمادات ۔ نباتات ۔ حیوانات) کی اصل ہے جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے ۔

پھر یہ تذکرہ عناصر ایک ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان کے شدۃ و ضعف کے باہمی مراتب پر بھی ایک سیر حاصل روشنی پڑ گئی ہے کہ اُن میں سے مثلاً مٹی سب سے زیادہ ضعیف ہے اُس سے قوی لوہا ہے جو اجزاء ارضیہ میں سے ہے اُس سے اشد آگ ہے اُس سے اشد پانی ہے اور اُس سے اشد ہوا ہے یہ بیان قال نعم الریح تک چلا گیا ہے ۔

پھر ان مادّی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رُخ فرماتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزو انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے زیادہ اقویٰ اور اشد انسان ہے جس کا ذکر قال نعم ابنُ آدم کے جملے سے فرمایا گیا ہے جیسا کہ میں نے انسانی افعال دکھلا کر واضح کر دیا ہے کہ انسان ہی وہ نوع ہے جس کے اشاروں پر تمام مادّیات اور سارے ہی موالید ناچ رہے ہیں ۔

پھر ان مادّیات سے منتقل ہو کر روحانیات کی طرف حدیث مبارک کا رُخ ہوا اور بتلایا گیا کہ ابن آدم علی الاطلاق اشد اور اقویٰ نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ روحانی بنے اور مادّی نہ رہے ۔ یعنی مادّیات کو ترک کرتا ہو جس کا بیان تصدَّقَ صدقۃً میں فرمایا گیا ہے ۔ کیونکہ صدقہ ہی ترک ماسویٰ یا ترک مادّیات کا نام ہے ۔

پھر روحانیات سے منتقل ہو کر روح کے بھی اعلیٰ مقامات تجرد خالص اور غوائل نفسانیہ سے برات اور کثافتِ اخلاق سے پاکی پھر لطافت اخلاق سے آراستگی کی طرف حدیث کا رُخ ہوا اور بتلایا گیا کہ انسان کا محض صدقہ دیدینا

یا مادیات سے انقطاع کر لینا بھی کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس میں اخلاص اور قطع ریا نہ ہو اور اسی کا نام اخفاء صدقہ ہے جس کا بیان یخفیھا میں فرمایا گیا ہے یعنی محض صدقہ دہندہ سے وہ مخلص صدقہ دہندہ قوی اور شدید ہوتا ہے جس کے صدقہ میں ریاء و نمود کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صدقہ یا ترک مادیات محض حسبۃً للّٰہ ہو اور یہ متصدق بجائے مادی ہونے کے روحانی بنکر صدقہ دیرہا ہو۔

پھر فرمایا گیا کہ مخلوق سے چھپا کر صدقہ کرنا بھی قوۃ و شدۃ کے لئے کافی نہیں جب تک کہ خود اپنے نفس سے بھی اُس کو مخفی نہ رکھا جائے یعنی اُس میں خود بینی اور اعجاب و ناز بھی شامل نہ ہوا اور خود اپنے نفس میں اُس کو کوئی چیز بھی نہ سمجھا جاتا ہو۔ گویا صدقہ دہندہ نفسانی ہونے کے بجائے خالص ربانی بنکر صدقہ کرے تو وہ تمام عناصر اربعہ تمام موالید تمام انسانوں تمام صدقہ دہندہ انسانوں پھر تمام مخلص ادب ریا صدقہ دہندوں سے بھی اشد و اقوی ہوگا۔ اسی مقام کیطرف یخفیھا من شمالہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے یعنی اس درجہ مخفی صدقہ ہو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کسے دیا؟

پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور ترک کی یہ کامل شان کہ آدمی نے دنیا ہی کو نہیں خود اپنے نفس کو بھی چھوڑ دیا ہو جب کہ دنیا اور اپنے نفس کے دکھاوے کے لئے نہیں تو ظاہر ہے بجز خدا کے اور کس کے دکھلانے کے لئے ہو سکتی ہے اور جب کہ خدا کے لئے ہونے یعنی اس کامل للہیت نے یا بالفاظ دیگر صدقہ کی نسبۃ خدا کی طرف ہو جانے نے اس ضعیف البنیان صدقہ دہندہ میں وہ غیر معمولی طاقت پیدا کر دی کہ اُس نے ساری مادیات اور اُس کے عناصر و موالید کو مسخر کر لیا تو اس سے صاف واضح ہو گیا کہ حقیقتاً قوی مطلق اور شدید مطلق صرف خدا ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اُسی کی طرف دوڑنے یا اُسی سے نسبۃ پیدا کرنے میں ساری

قوتیں اور شدتیں پنہاں ہیں۔

اُدہر حدیث ہی کی ترتیب بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قوۃ و طاقۃ بقدر لطافۃ ہوتی ہے تو یہ بھی حدیث ہی کی دلالت سے نکل آیا کہ جو خدا قوۃ و طاقۃ اور شدۃ کا مخزن ہے وہی لامحدود لطافۃ کا بھی مخزن ہے چنانچہ اُس کی لامحدود لطافۃ کا یہ عالم ہے کہ اُسے نگاہیں بھی نہیں پاسکتیں۔

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک — اُس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوتی اور وہ سب
الابصار و ھو اللطیف الخبیر — نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔

اس لئے اسی حدیث سے گویا یہ اصول بھی مستنبط ہو گیا کہ قوی و متین صرف اللہ کی ذات ہے پھر جو اُس سے مناسبۃ پیدا کرے وہ بقدر مناسبۃ قوی ہو جاتا ہے اور اُس سے مناسبۃ پیدا کرنے کا طریقہ مادیات سے ہٹ کر روحانیات کی طرف آنا ہے جس کا طریق صدقہ ہے چونکہ مخلص متصدق جو بلا اعجاب نفس اور بلا ریا رخلق صدقہ دیتا ہے اُس سے کامل مناسبۃ پیدا کر لیتا ہے اس لئے وہی کامل لطافۃ کا حامل اور سب سے بڑھکر طاقتور ہو جاتا ہے۔

مباحث حدیث کے لطیف نتائج

بہر حال حدیث کے اس مرتب بیان سے کہ ہر کثیف کو پہلے بیان کیا اور ہر لطیف کو اُس کے بعد اور پھر ہر پچھلے کو پہلے سے اشد و اقوی فرمایا یہ ثابت ہو گیا کہ معیار شدۃ و قوۃ یہ وصف لطافۃ ہی ہے اور اس کی ترتیب طبعی یہی ہو سکتی تھی کہ مٹی سے لطیف لوہا۔ لوہے سے لطیف آگ آگ سے لطیف پانی۔ پانی سے لطیف ہوا۔ ہوا سے لطیف انسان۔ عام انسانوں سے لطیف تارک الدنیا اور عام تارکین دنیا سے لطیف وہ تارک مخلص اور زاہد بے ریا انسان ہے جس کا قلب

شواغل دنیا سے پاک مادّیات کی محبت سے بالاتر مادّی کثافتوں سے نفور اور روحانی لطافتوں کا محور ہو۔ گویا وہ روحانی اور ربّانی انسان ہی کامل لطافۃ کے حامل بن سکتے ہیں۔ جو بدنوں کے پالنے میں منہمک نہ ہوں بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں اور مادّی تصرفات کے بجائے روحانی اعمال اُن کا شعار بن گئے ہوں۔

لطافت رُوح مذہبی بننے میں مضمر ہے

اور یہ سب جانتے ہیں کہ ربّانی بننے کے طریقے اور روحانی شعائر برپا کرنے کے ڈھنگ سکھلانا مذہب کا موضوع ہے نہ کہ سائنس کا اس لئے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ لطیف تر اور قوی تر انسان وہی ہو سکتا ہے جو مذہبی ہو اور جس کا اوڑھنا اور بچھونا مذہب ہی مذہب ہو چکا ہو۔ اس لئے حدیث سے جہاں قوۃ و شدۃ کا معیار مستفاد ہوا کہ وہ لطافتہ ہے۔ وہیں حصول لطافتہ کا طریقہ بھی مستفاد ہوا کہ وہ مذہب ہے جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافتہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح رُوح بادشاہ ٹھہر جاتی ہے۔ جو اُس کا حقیقی منصب ہے جسم اُس کا غلام ٹھہرتا ہے۔ جو اُس کا منصب ہے نفس اس مملکت کا خاکروب ٹھہرتا ہے جو تقویٰ کے وسیلہ سے سیّات کا کوڑا کرکٹ صاف کرے چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا نہ پھرے عقل اُس کا وزیر ٹھہر جاتی ہے جو مفید مشورے دے وحی الٰہی اُس کا حتمی قانون ٹھہر جاتی ہے جس سے راہ ملے اور اس طرح رُوح کی منظّم حکمرانی سے روحانیت کا عدل چاردانگ اقلیم بدن میں پھیل جاتا ہے چور اور ڈاکو مقیّد ہو جاتے ہیں جن سے بدامنی پھیلتی تھی۔ پھر ایسے مامون اور مضبوط ملک میں جس کا فرمانروا بیدار وزیر دانشمند قانون روشن اور عدل وانصاف

کے سبب پوری اقلیم منظم ہو نہ تو بیرونی دشمنوں کو حملہ کی ہمت ہوتی ہے کہ اس اقلیم میں گھسکر فتنہ و فساد مچائیں۔ اور نہ اندرونی خائنوں اور چوروں کو جرأت ہوتی ہے کہ بدنظمی پھیلائیں۔ بیرونی دشمن یعنی شیطان کے بارہ میں تو قرآن نے فرمایا کہ

انہ لیس لہٗ سلطان علی الذین امنوا وعلیٰ ربھم یتوکلون	یقیناً اُس کا رشیطان کا، قابو اُن لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اور اندرونی دشمن یعنی نفس امارّہ کے بارہ میں فرمایا کہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا اور اُسی پر مطمئن اور راضی بن جاتا ہے ارشاد ربانی ہے:

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ	اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کیطرف چل اسطرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

اسلام کی بنیادی حقیقت

اب اس تمام مضمون کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ یہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم شدہ ہے۔ مادیت اور روحانیت یا سائنس اور اسلام۔ اسلام اور روحانیت کی بنیاد بمجوائے حدیث دو اصول پر ہے۔ ایک ترک ماسوی اللہ جسے صدقہ سے تعبیر کیا گیا اور ایک اخلاص جسے اخفار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے اصول کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا ہو یا اپنا نفس اور ہوائے نفس سب کی وہ الفت قلب سے نکال پھینکنا جو الفت حق میں خلل انداز ہو۔ اور دوسرے اصول کا حاصل یہ ہے کہ اس ترک ماسویٰ میں خالص اُسی ایک محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہو جو اس ارض وسمار کی محفل کا خالق ہے۔ اس بارہ میں نہ خودبینی ہو نہ خود نمائی نہ خودی ہو نہ خودستائی۔

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے

اس کے بالمقابل سائنس کی بنیاد جو اسلام کا متقابل ہے خود بخود ان دو اصولوں کی ضدوں پر نکل آتی ہے ترک ماسویٰ کی ضد حُبِّ ماسویٰ ہے اور اخلاق کی ضد نفاق ہے۔ حُبِّ ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ ہر غیر اللہ اور ہر باطل کی محبت ہو اور نہ ہو تو خدا اور حق کی محبت نہ ہو چونکہ غیر اللہ کی محبت کے سلسلہ میں اپنا نفس سب سے مقدم ہے اس لئے گویا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اپنے نفس سے ہو اور نفس کو چونکہ تمام مادّی لذائذ سے محبت ہے اسلئے بواسطۂ نفس سارے مادّی لذائذ سے محبت ہو جس کا نام دنیا ہے گویا حُبِّ ماسویٰ کا حاصل حُبِّ دنیا اور حُبِّ نفس نکلا۔ دوسری اصل یعنی نفاق کا حاصل یہ ہے کہ یہ نفس بجاہل بوجہ حقیقت ناشناسی کے انہی مادّی لذائذ کو جن کی صورت آراستہ ہے اور انجام گندہ ہے اپنا منتہائے مقصود ظاہر کرنا چاہتا ہے لیکن جبکہ فی نفسہ یہ مادّی لذائذ کسی برتری اور انجام کی خوبی نہ رکھنے کے سبب اہل بصیرۃ کی نگاہوں میں باوقعت نہیں بنتے اور وہ ایسے دنی نفوس کو قابل ملامت ہی سمجھتے رہتے ہیں اس لئے یہ نفوس اپنے خسیس مطلوبات پر اصول اور شائستگی کا پردہ ڈالکر انہیں معقول باور کرانے کی سعی کرتے ہیں اور اس قسم کے تمام نفسانی جذبات کو جن سے مذاق سلیم کتراتا ہے کمالات کا لباس پہنا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ اپنے ان خسیس مطلوبات کو عام نگاہوں میں کچھ باوقعت بنا سکیں مثلاً عام لہو و لعب اور بازاری رقص و سرود کو فنون لطیفہ کے عنوان سے پیش کرتے ہیں منتظم عیاشیوں اور بدکاریوں کو قانونی رنگ میں لیکر تہذیب و تمدن کا عنوان دیتے ہیں۔ استعمار اور جوع الارض کو خوشنما الفاظ میں پیش کر کے

ترقی کا عنوان دیتے ہیں جنگی آلات کی بے پناہ خونریزیوں اور تباہی نہائیں کو جنگ حق و صداقت اور قیام امن کے نام سے یاد کرتے ہیں وسائل عیش و طرب کی فراہمی کو سوسائٹی کی بلندی اور برتری سے تعبیر کرتے ہیں پرستش اپنے نفس اور ہوائے نفس کی کرتے ہیں اور الفاظ کے چکر سے اسی کو حق کی پرستش دکھلاتے ہیں۔ عقیدت و اطاعت اپنے جذبات کی ہوتی ہے اور نام سچائی کی عقیدت کا لیتے ہیں غرض یہ مادی نفوس اچھے عنوان سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوسناکیوں کو چھپانے اور انہیں خوبصورت لباس میں دکھلا کر با وقعت بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ درحالیکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نفاق کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اندر کچھ ہو اور دکھلایا کچھ جائے باطن گندہ ہو اور ظاہر کو آراستہ بنایا جائے۔ اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو دھوکہ اور فریب دیا جائے۔

مادی تمدن کی انہی خوشنمائیوں اور گندم نما جو فروشیوں کو قرآن حکیم نے زینۃ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کی حقیقت یہی ہے کہ اندر کچھ نہ ہو مگر ٹیپ ٹاپ اور سطحی آرائش سے اس میں دلفریبی کافی پیدا کر دی جائے ارشاد حق ہے۔

زین للناس حب الشھوت من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب۔

خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی۔ عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے۔ لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے۔ مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

اس میں شہوت پرستیوں مالی ہوسناکیوں۔ اسباب مفاخرۃ وریاست
غرض مالی تکاثر اور جاہی تفاخر کو زینۃ دنیا فرما کر بتلایا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں۔
زن۔ زر۔ زمین وغیرہ میں محض سطحی عاجل اور ناپائیدار لذت ہے ورنہ ان کی
اندرونی حالت تیرہ وسیاہ ہے اور ان سب کی وابستگی کا انجام کدورت اور
تلخی ہے۔ اگرچہ اس پر کتنے ہی خوشنما پردے اور دلفریب عنوانات کے لباس
پڑے ہوئے ہوں۔ جس کا حاصل وہی بے حقیقت دکھلاوا ہے جسے اصطلاحی
الفاظ میں نفاق کہتے ہیں۔

اب اگر آپ غور کریں تو سائنس کے ان دونوں بنیادی اصول۔ جب
ماسوئی اور نفاق کی حقیقت باطل نکلتی ہے نفاق کا باطل ہونا تو اس لئے
ظاہر ہے کہ باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ دیکھنے میں بہت کچھ ہو اور حقیقت میں
کچھ بھی نہ ہو اوپر سے چمک رہا ہو اور اندر سے تاریک ہو۔ پس جب کہ نفاق کی
بھی یہی کیفیت ہے کہ اندر کچھ ہو اور اوپر کچھ ہو تو نفاق کا باطل ہونا واضح ہے۔

ادھر ماسوی اللہ بھی باطل ہی کا ترجمہ ہے کیونکہ ہر ماسوی اللہ کی ہستی
ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے وجود دینے سے قائم ہوتی ہے نہ وہ از خود قائم ہے اور
نہ از خود موجود ہے اس لئے حقیقتاً ماسوی اللہ کی ذات میں کوئی وجود یا کوئی
کمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ محض وجود حق اور کمالات حق کا مظاہرہ
ہوتا ہے۔ اور جبکہ ماسوی اللہ کا خواہ وہ نفس انسانی ہو یا دوسرے موالید
عناصر اربعہ ہوں یا دوسرے اجزاء کائنات خود کوئی وجود ہی نہ نکلا تو وہ بظاہر
تو موجود ہیں مگر حقیقتاً کوئی ہستی ہی نہیں رکھتے اس لئے کل کا کل ماسوی اللہ
بھی اپنی ذات سے باطل ہی نکلا۔

الا کل شیءٍ ما خلا اللہ باطل

اور جبکہ سائنس کی بنیاد انہی دو باطلوں پر تھی ایک خدا سے قطع ہو کر ماسوی اللہ پر جو آفاقی باطل ہے ایک نفاق پر جو نفسی باطل ہے تو پوری سائنس کی حقیقت بجز باطل ہونے اور باطل پسندی کے اور کچھ نہ ہوئی جس پر سائنس دانوں کا یہ ناز اور شور و شغب ہے کہ اس سے ساری زمین اور آسمانی فضاء گونج رہی ہے۔
ہاں اس کے بالمقابل اگر ماسوی اللہ کو ترک کر کے اللہ کو اختیار کیا جائے تو وہ حق ہے اور نفاق کو ترک کر کے اخلاص کو اختیار کر لیا جائے تو وہ بھی حق ہے اور اللہ کے ساتھ اسی مخلصانہ تعلق قائم کرنے ہی کا نام اسلام ہے تو اسلام کی بنیاد ایسے حق پر نکلتی ہے جس میں باطل کا نشان نہیں اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سائنس تو ایک شور بے بنیاد اور باطل کا نام ہے اور اسلام ایک حقیقت ثابتہ اور حق کا نام ہے جس کی جڑیں مستحکم اور دائمی ہیں۔ باطل کا کلمہ بے بنیاد حق کا کلمہ اپنی بنیادوں پر ثابت و راسخ ہے۔

الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون۔ ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض ما لھا من قرار۔

کیا آپکو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمۂ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جسکی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہو اور اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں اور گندہ کلمہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اسکو کچھ ثبات نہ ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مگر اس تقریر سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ میں نفس سائنس اور اسکی ایجادات کو روک رہا ہوں یا سائنس کی

تعلیم پر حرمت کا فتویٰ دے رہا ہوں یا اُس میں اشتغال کلیتہً باطل ہے۔ بلکہ مقصود وہی ہے جو مختلف عنوانوں سے تقریر کے ذیل میں آچکا ہے کہ میں اُسے قبلۂ مقصود اور کعبۂ مطلوب بنانے سے منع کر رہا ہوں۔ اگر یہ ساری جد وجہد جو آج سائنس کے سلسلہ میں کیجا رہی ہے کسی حقیقی مقصود کے لئے ہو تو وہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ آج کے دور میں مطلوب ہے۔ اور وہ مقصود نہ ساری دنیا ہے کہ وہ تو خود وسیلہ ہے نہ مادی راحت و آرام ہے کہ وہ بھی وسیلہ ہے بلکہ ایک مسلمان کے لئے آخرت اور اُس کی مذہبی دیانت ہی ہو سکتی ہے کہ وہی مقصود اصلی ہے اور اسی کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

پس سائنس مذہب سے بے تعلق رہکر کلمۂ خبیثہ ہے جس کے لئے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور ذریعہ مطلوب کے وابستہ ہوکر وہ بلاشبہ نافع اور کارآمد ہوگی اور کلمۂ طیبہ ہی کے ذیل میں آجائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں۔

لیکن میں جہاں تک محسوس کرتا ہوں آج سائنسی جد وجہد ایک حقیقی مقصود کی سی نظر آرہی ہے لوگ اُس پر اُسی کی خاطر جھک پڑے ہیں۔ اور نہ صرف یہی کہ اُس کے رد و قبول کا معیار مذہب کو نہیں بنایا گیا بلکہ بیشتر مواقع میں اُسے مذہب کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور گویا سائنس ایک ایسا مقصود ہے کہ مذہب اُس کا وسیلہ تک بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا چہ جائیکہ اُس کا مقصود قرار پائے۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا کے قدیم مذاہب کے لئے سائنس نے کوئی ایسا ہی تخریبی اقدام کیا ہو۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کے جس مذہب کے ایک ایک جزو کی ساتھ سائنس ساتھ رہکر چل سکتی ہے وہ صرف مذہب فطرۃ یعنی مذہب اسلام

ہے۔ اگر اس کی تفصیلات دیکھنی ہوں تو میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ "تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام" لکھا ہے جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے جسمیں دلائل واضحہ سے دکھلا دیا گیا ہے کہ سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلام کی معنویتوں کا مادّی رُخ ہیں اور اُس دور میں اسلام کی تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لئے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوۃ پہونچائے اور جو اُسے مستقلاً مقصود بنا کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہونچائے گا مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

طلبائے یونیورسٹی کیلئے مقام عبرت

بہر حال جبکہ سائنس محض یعنی بلا توسط مذہب کلمہ خبیثہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور اسلام کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑیں مستحکم اور ہستی پائیدار ہے تو نیک نہاد اسلامی فرزندوں کے لئے اس میں سے عبرت و موعظۃ پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقات عزیزکو سائنس محض کے معمولات میں اس طرح نہ گنوائیں کہ وہ مقصود اصلی قرار پا جائے اور اُس کی فانی لذات اصل ہو جائیں کہ یہ انجام کی ندامت کا سبب ہوگا۔ نیز وہ اُن اقوام کی ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ نہ ہوں جنہوں نے آگ پانی ہوا مٹی کے گھروندے سے کچھ چمکیلی چیزیں بنا کر دنیا کے لہو و لعب میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس چمک دمک کی عمر بہت قلیل اور ہمیشہ قلیل ہی رہتی آئی ہے۔ یہ سائنسی تمدن اور شہریت کی مکر چاندنی ایک متاع قلیل۔ اور اس تمدن میں منہمک رہنے والی اقوام کی زندگی بہت محدود اور چند روزہ ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے کہ چمکیلی تہذیب اپنے ہی تمدن سے ٹکرائے اور اپنے

ہی متمدنوں کو اس اندرونی تصادم اور ٹکر سے ختم کر ڈالے۔

لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِینَ كَفَرُوا فِی الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِیلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ

تم کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈالدے ؛ چند روزہ بہار ہے۔ پھر اُن کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ اور وہ برا ہی آرامگاہ ہے۔

دیکھنے میں عناصر اربعہ بھی نہایت نظر فریب ہیں۔ آگ نہایت چمکیلی باکر و فر اور حرارت کے دور اس اثرات کی مالک ہے پانی دیکھنے میں چاندی کی طرح شفاف اور نمناکی کے پھیلنے والے اثرات کا حامل ہے۔ ہوا بظاہر لطافت کے سبب نہایت رقیق الجسم اور ہر جگہ بذات خود منتشر اور موجود ہے۔ کرۂ زمین بحیثیت مجموعی نگاہوں میں نہایت باعظمت و شکوہ اور ماند نظر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر اپنے جبلّی اخلاق و آثار کی بدولت یہ چاروں ہی عناصر محتاج پسماندہ اور بعید ذلیل ثابت ہوئے اور ان کی یہ ظاہری چمک دمک اُن کی جوہری پستی کو نہ مٹا سکی جیسا کہ مفصل ثابت ہو چکا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ جس قوم یا سوسائٹی یا فرد پر ان مادّی اخلاق کا غلبہ ہوا اور وہ رات دن مادّیات ہی کے جوڑ توڑ میں لگی رہے تو وہ قوم یا سوسائٹی گو بظاہر آگ کی سی چمک پانی کا سا گوارا رنگ ہوا کی سی دوررسی اور پھیلاؤ اور زمین کی سی ٹھوس عظمت کی مالک نظر آرہی ہو مگر اپنے ان مادّی اخلاق کے سبب جو اُس میں مادّی اشتغال کی بدولت رچ چکے ہوں اپنے کو انجام کی ذلّت و خواری سے کسی طرح نہیں بچا سکتی۔ جو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اُس کے سامنے آکر رہے گی۔ کیونکہ جس مادّہ کی قسمت میں بد و فطرت ہی سے کوئی عزّت نہیں لکھی گئی اس کی بنائی ہوئی قومی عمارتیں جتنی بھی زیادہ سربفلک ہوں گی اتنی ہی جلد منہدم ہو جائینگی۔

خاتمۂ کلام اور خلاصۂ نصیحت

پس اے عزیزانِ ملّت آج کی نام نہاد متمدن اقوام کی ظاہری شوکت پر نہ جاؤ ان کا ہلاکت آفریں انجام عنقریب ہی سامنے آنے والا ہے ایسا نہ ہو کہ خدا نکردہ اُن کی نقالی اور تقلید سے تم بھی اُس انجام کی لپیٹ میں آجاؤ۔ ان اقوام کی طاقت آپ کے ضعف میں مضمر ہے نہ کہ خود اُن کے کسی جوہر میں روحانیوں نے میدان چھوڑ دیا تو مادّیوں نے اُسے آ دبایا۔ ورنہ جب دورِ اسلاف میں روحانیوں کی کثرۃ اور روحانی قومیت قائم تھی تو دنیا جانتی ہے کہ اُنہوں نے مادّی عظمتوں کو کس کس طرح نیچا دکھایا اور مادّی رفعتوں کی کیا گت بنائی ہے۔ اگر آج بھی آپ اپنی حقیقت پہچان کر حقیقت پسند بنجائیں تو وہ سابقہ عظمت لوٹ سکتی ہے ورنہ یہ صورتوں کی نمائشیں زیادہ دیر پا ثابت نہو سکیں گی۔

بہرحال حدیث کی ایک حد تک شرح ہو چکی ہے اور سائنس اور اسلام کے موضوع کے عوارض یعنی دونوں کی حقیقت دونوں کی غرض و غایت دونوں میں مقصود اور وسیلہ کی تعیین دونوں کے طبعی اخلاق و خواص دونوں کا انجام اور پھر دونوں کا مقتضا میں نے اپنی بساط کے موافق اس حدیث سے استنباط کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور جس عنوان کا بیان آپ حضرات نے مجھ پر عائد فرمایا تھا الحمد للہ کہ میں اُس سے ایک حد تک عہدہ برآ ہو چکا ہوں اس لئے دعائے توفیق و استقامت پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

TRUST STACKS

احقر
محمد طیب غفرلہ ولوالدیہ
مہتمم دار العلوم دیوبند

۷ اگست ۱۹۳۸ء مطابق ۹ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ
(یوم یکشنبہ)

تقریظ

(از حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند)

حامداً و مصلیاً و مسلماً، امابعد، اس رسالے کے اوراق اس مقبول عام تقریر کے حامل ہیں جو عالی جناب مولانا الحاج المولوی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے "اسلام اور سائنس" کے خشک مگر ضروری عنوان پر بمقام علیگڑھ کالج اسٹریچی ہال میں فرمائی تھی خالص علمی اور خشک عنوان پر تقریر اور ایسے شخص کی تقریر جس کو کتب عربیہ کے مطالعہ، عربی طلبہ کے ہجوم میں عربی الفاظ و مصطلحات کی مزاولت، سے فرصت ہی نہ ملتی ہو، اور وہ بھی ایسے مجمع میں کہ جہاں اس کے برعکس انگریزی زبان اور اس کے محاورات مادری زبان کے حکم میں آ گئے ہوں یقیناً اضداد کے اجتماع کے حکم میں تھی، اور اگر ضب (سوسمار) اور نون (ماہی) کی ضدیت اور بُعد مکانی کا صحیح مشاہدہ ہو سکتا تھا تو یہاں ہونا چاہئے تھا، لیکن بیان کی سلاست، مضامین کے ارتباط، اور دقائق علمیہ ظاہرانہ انداز سے روزمرہ کے محاورہ میں ادا کرنے نے ایسا سہل الحصول صعب بنا دیا ہے کہ اسکے شروع ہو جانیکے بعد ختم کلام سے پہلے سیری ہی نہیں ہوتی ہے۔

پھر یہی نہیں کہ صرف اسلام اور سائنس کے ہر ہر گوشہ پر مقرر ممدوح نے روشنی ڈالکر اس پتھریلے راستہ اور سنگلاخ زمین کو طریقہ بیضا بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے معارف و دقائق علمی و اسلامی بھی نہایت سہولت کے ساتھ اہل بصیرت و ارباب نظر کے پیش نظر کر دیے، اور قابل تحسین یہ امر ہے کہ جس جگہ کوئی ایسا دقیقہ علمیہ سمجھانا ہوا جس کو سمجھنے کے لئے علوم قدیمہ سے واقفیت، مصطلحات فنونیہ کا تداول شرط تھا، بالحقیقت اس میں مقرر کے لئے دلچسپی پیدا کر دینا ضروری تھا تاکہ اذہان میں نشاط پیدا ہو اس کو اگر ایک جگہ معمولی معمولی مثالیں دیکر کالشمس فی نصف النہار

کردیا تو دوسری جگہ ادیبانہ تشبیہات، واستعارات، لطائف وظرائف سے مزین بناکر ذہن نشین کردیا۔

پس یقیناً یہ تقریر اگر ایک جانب حقائق اسلامیہ، معارف شرعیہ کا آئینہ ہے تو دوسری جانب ادبی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی ہے۔

درکفے جام شریعت، درکفے سندان عشق + ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

پس اگر یہ امر قابل تعجب نہیں کہ مشک ان دماغوں کو معطر کردیتا ہے جو مؤف نہوں تو یہ بھی شایان تعجب نہیں کہ نزدیکان بے بصر کے علاوہ تمام قلوب اس تقریر سے مستفید ہوئے اور اگر یہ لائق حیرت نہیں کہ آفتاب افق مشرق سے طلوع کرنے کے بعد اپنے مقابل زمین کے ہر ہر گوشہ کو منور کردیتا ہے تو یہ بھی موجب حیرت نہیں کہ اس تقریر نے مسئلہ مبحوث عنہا کے کسی گوشہ کو روشن کئے بغیر نہ چھوڑا، اور اگر یہ صحیح ہے کہ ٹھنڈا اور میٹھا، غیر مکدر پانی ا پیاسوں کی پیاس کا ازالہ اس طرح کردیتا ہے کہ ان کے رونگٹے رونگٹے سے تشنگی کی اذیت، یبوست کی تکلیف زائل ہوجاتی ہے، تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اس تقریر نے عنوان بالا سے متعلق تشنگان کمال کی تشنگی اسی دلچسپی کے ساتھ زائل کردی جو پیاسے کو پانی سے ہوتی ہے۔

قاسمی فیضان کی وجہ سے میرے نزدیک تو نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقرر ممدوح کی دوسری تقریریں، یا تالیفات، اگر کسی ناواقف کو تعجب ہو تو وہ جانے اس کا کام۔

عجیب فی الزمان وما عجیب   اتی من آل سیار عجیبا

محمد اعزاز علی غفرلہٗ

نوٹ:۔ کاپی کی ترتیب غلط ہوجانیکی وجہ سے ہم حضرت مولانا کی اس فاضلانہ تقریظ کو اسکے شایانِ شان جگہ نہ دے سکے جسکے لئے ہم حضرت موصوف سے بیحد نادم اور معذرت خواہ ہیں۔
محمد حامد اللہ انصاری عفی عنہ

۱۱۰۴۶

غلط نامہ

ہمیں بیحد افسوس ہے کہ ہماری انتہائی سعی کے باوجود رسالہ ہذا میں کچھ اغلاط باقی رہ گئیں جس کے لئے ہم بیحد معذرت خواہ ہیں۔ ناظرینِ کرام سے التماس ہے کہ اس غلط نامہ کے بموجب جملہ اغلاط کی تصحیح فرمالیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۱۳	تاکر	تاکہ	۴۷	۸	مابہ	مایہ
۸	۲	واسخ	راسخ	۴۸	۳،۴	مابہ	مایہ
۱۱	۱۷	بتھروں	پتھروں	۶۵	۷	سلہ	وسیلہ
۱۲	۴	اسے	اسے	″	۱۰	خودی	خود ہی
″	۸	خدوخال	خط وخال	۶۸	۱۶	حرض	حرص
۱۳	۱۰	ٹھونس	ٹھوس	۷۴	۱	ہوتلے	ہوئے
″	۱۴	دوسرنیر	دوسروں پر	″	۸	چہ جا بلکہ	چہ جائیکہ
۱۴	۵	اُجہل	ادجہل	″	۱۲	قاورات	محاورات
۱۵	۱۲	بھی آگ سے زیادہ	آگ سے بھی زیادہ	۷۵	۸	ور	در
۱۸	۱۴	تھنخون	تنخون	″	۱۳	ششتم	ختم
۲۱	۴	رائیر گنوں	ایر گنوب*	″	۱۴	دستوار	استوار
۲۲	۴	یعنی	لیتی	۷۸	۲	بخنیہا	بخیہا
۲۳	۱۶	خجامتہ	فجامتہ	۷۹	۱۵	کیف	کثیف
۲۴	۱۶	تتراتہ	تتراقہ	″	۱۸	لطمف	لطیف
۲۷	۴	ہوامیں	ہوائیں	۸۰	۴	لکے	لگے

نوٹ: حضرت مولانا نے بعض الفاظ عربی طرز میں لکھے ہیں جنہیں بجنسہٖ لکھوا دیا گیا ہے۔ مثلاً خدمت کے بجائے خدمتہ۔ علامت کے بجائے علامتہ۔ قارئین کرام نوٹ فرمائیں۔

محامداللہ انصاری عفی عنہ
معتمد نشر واشاعت

*air guns

سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلامی تاریخ و تمدن (۳)

فردوس گم گشتہ

(از جناب غلام احمد صاحب پرویز رکن ادارہ طلوع اسلام دہلی)

پرویز صاحب کی ذات گرامی اسلامی اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں

آپ تقریباً پندرہ سال سے قرآن کریم کا ایک عمیق مطالعہ فرما رہے ہیں اور دو تین سال سے آپ نے مسلمانوں سے متعلق ان تمام اہم مسائل کو جو ہندوستان کی سیاست میں پیدا ہوتے رہتے ہیں کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھنے اور فرقان حکیم کی کسوٹی پر پرکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے جس میں الحمد للہ بہت کامیاب ہیں -

فردوس گم گشتہ آپ کے عمیق مطالعۂ قرآنی اور علوم اسلامی کے گہرے غور و خوض کا ایک مبارک ثمرہ ہے جو آپ نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر طلباء و اساتذہ مسلم یونیورسٹی کے سامنے پیش فرمایا، جس میں قانون فطرت اجتماعیات اسلام، خلافت الٰہیہ خلافت نبویہ اور اسلام کے عناصر ترکیبی پر ایک سیر حاصل بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اسلام جماعتی زندگی کا دوسرا نام ہے اور اجتماعی زندگی کے بغیر اسلام کا تصور ہی غلط ہے -

جناب پرویز نے موضوع سے متعلق تمام امور کو زیر بحث لے لیا ہے اور جا بجا آیات قرآنی سے استدلال فرما کر مضمون کو اور زیادہ دلنشین بنا دیا ہے - خلافت راشدہ کے نظام کے بعد ہماری اجتماعی زندگی کیونکر منتشر ہو گئی، اس کے اسباب و علل اور پھر اس اجتماعی نظام کو استوار و مضبوط کرنے کے وسائل ــــ یہ تمام باتیں نہایت جامع طور سے اس مختصر مقالے میں بیان کر دی گئی ہیں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے کلام کی جا بجا مثالوں نے بیان کو اور زیادہ دلآویز و دلپذیر کر دیا ہے - زبان حلاوت آمیز اور پیرایہ بیان آسان اور عام فہم ہے - لکھائی چھپائی بہترین ضخامت ۲۰ صفحات سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ قیمت صرف ۲ / ر

ملنے کا پتہ پشت پر ملاحظہ فرمایئے

سلسلہ مطبوعات انجمن اسلامی تاریخ وتمدن (۱)

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

یعنی

متکلم اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ بصیرت افروز مقالہ جوانہ
انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کے زیر اہتمام ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ئ کو مسلم یونیورسٹی کے طلبا ، وا سا
و دیگر اہل علم حضرات کے ایک عظیم الشان اجتماع میں پڑھا جس میں مولانا ممدوح نے
اپنے مخصوص انداز میں اسلامی حکومت کے صحیح تخیل کی توضیح کرتے ہوئے ان تمام
خیالیوں کا ازالہ کیا ہے جو آجکل کے رہبر ہندوستانی مسلمانوں کی تنظیم میں کر رہے ہیں
دیکھنے میں تو یہ مقالہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے مگر اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے
موضوع کا ہر پہلو زیر بحث آگیا ہے۔ نظام حکومت کا طبعی ارتقاء اصولی حکومت' اسلا
انقلاب کی سبیل' خلافت الٰہیہ اور اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار اس کے خاص عنوا
ہیں۔ زبان دلنشین و دلپذیر پیرایۂ بیان سلیس عام فہم اور مدلل ہے، غرضیکہ اس مختص
رسالے کی افادی حیثیت بڑی بڑی تصانیف سے کچھ کم نہیں۔ جو لوگ دور حاضر
اس اہم مسئلہ کو واقعی سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس میں بڑی حد تک اطمینان بخش مواد ا
دلائل پائیں گے۔

کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ چکنا ۲۰ پاؤنڈ سائز $\frac{۲۲ \times ۸}{۸}$
ضخامت ۴۰ صفحات' ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۳ر محصولڈاک ۱ر
اصحاب ذوق پتہ ذیل سے طلب فرمائیں۔

حامد اللہ انصاری

معتمد نشر واشاعت انجمن اسلامی تاریخ وتمد
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ